

# بھنگا بنگا کاکا



ادیب شہیر :  
حضرت مولانا محمد وارث جمال قادری

# بھنگی پٹکوں کا بوجھ

از  
ادیب شہید

حضرت مولانا محمد وارث جمال قادری

ناشر

شبیر پراڈرز - ۴۰ بی اردو بازار لاہور

85216

نام کتاب ————— بھیگی پلکوں کا بوجھ

نام مصنف ————— محمد وارث جمال قادری

نام ناشر ————— شبیر برادرزہ لاہور

نام کاتب ————— اعجاز احمد ساقی

تعداد اشاعت ————— چھ سو

سن اشاعت ————— ۱۹۹۳ء

نام مطبع ————— بک پرنٹرز لاہور

ہدیہ ————— روپے

# فہرستِ مضامین

- ۱۔ اہنتاب
- ۲۔ آغازِ سخن
- ۳۔ انجمنِ رضا کے مصطفیٰ
- ۴۔ مدنیہ کائنات عشق کی راجدھانی
- ۵۔ مجمع البحرین
- ۶۔ اندازِ مسیحائی
- ۷۔ متھرا کا پتہ
- ۸۔ بھنگی پلوں کا بوجھ
- ۹۔ دیوتا کی شکتی
- ۱۰۔ جلوہ رنگین کی تمنا
- ۱۱۔ کفن چور
- ۱۲۔ جہانِ حیرت

# ماخذ و مراجع

تالیخ طبری جلد دوم	حضرت امام جعفر ابن جریر الطبری
مکاشفة القلوب	حضرت امام غزالی
تذکرۃ الاولیاء	حضرت فرید الدین عطار
تذکرۃ المحدثین	مولانا غلام رسول فریدی
تحریک انجمن ہندو	پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود ایم اے
السواد الاعظم	پی ایچ ڈی
سیر الاولیاء	خواجہ امیر خورد
نفحات الانس	علامہ عبدالرحمن جامی
سقیۃ الاولیاء	شہزادہ دارہ شکوہ
حیات الصوفیہ	محمد ادریس انصاری
امیر خسرو	ڈاکٹر وحید مرزا
آب کوثر	پروفیسر محمد اکرم
دلی کے بانیس خواجہ	ظہور الحسن شارب
سوانح حیات شیخ المشائخ	مولانا نسیم بستوی
حکایات شیریں	مدیر مجلہ آئینہ لاہور
خسرو شناسی	ڈاکٹر ظ انصاری و ابو الفیض سحر
ریاض الشعراء	علی قلی خاں یاغستانی

# اٹھارہ سٹن

زیر نظر کتاب ” بھنگی پلکوں کا بوجھ “ میری کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً میں نے اپنی تجارتی مصروفیات سے وقت بچا کر بزبان حکایت لکھے۔ جو بحمدہ تعالیٰ ملک اور بیرون ملک کے موقر جرائد و رسائل اور ڈائجسٹوں میں شائع ہو کر قارئین سے بے پناہ پسندیدگی کا خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ میں نے کہیں بھی زیب داستان کے لیے ہرگز ہوا میں تیر نہیں چلایا بلکہ جو کچھ تحریر کیا ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر، اپنے ہر مضمون کے لیے میں نے پہلے مضبوط زمین تلاش کیا۔ پھر اس پر خاک کے بنائے، پھر اس میں کمالِ دلسوزی و دیدہ ریزی سے رنگ بھرے۔ تب جا کر کہیں عشق و محبت، حسن و عقیدت کا یہ سد اہسار گلستا تیار ہوا۔ اس طویل مسافت میں کچھ مقام ایسے بھی آئے جہاں پر خود میری پلکوں پر بار بار آنسو کرزے سے بے ساختہ آج ان کے بھی آنسو نکل آئے دیکھانہ گیا حال فقیرانہ کسی کا کتاب کے آخر میں میں نے ماخذ اور مراجع کی ایک فہرست بھی دیدی ہے۔ جس سے معلوم ہو گا کہ اس گلستا نو بہار کی

لاہ کاری میں کتنے گلستانوں سے گل ریزی کی ہے تب جا کر کہیں صحن  
تما میں محبت کے اس طرح پھول کھلے، عقیدت کے چشمے جاری ہوئے،  
اور عشق و وجدان کی لطافتیں نئی لذت سے آشنا ہوئیں۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے

دردِ دل کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

جب میں نے اسے کتابی شکل دی تو ملک کے موقر کتب خانوں کی طرف سے  
اشاعت کی پیشکش ہوئی ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ انجمن  
رضائے مصطفیٰ بڑھیا کے زندہ دل جوان بمت جوان حوصلہ ارکان

نے اصرار کر کے مسودہ مجھ سے حاصل کر لیا عین کارا ز تو آید و مرداں  
چنیں کنند۔ چونکہ اس انجمن کا ایک رکن میں بھی ہوں۔ اس لیے اور  
بھی مجھے انجمن کے ارکان کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے خوشی

محسوس ہو رہی ہے۔ اشاعتی محاذ پر یہ انجمن کا پہلا بڑا قدم ہے  
مولیٰ عزوجل اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل  
انجمن رضائے مصطفیٰ بڑھیا کے ارکان، اس کے ہمدردوں، بہی خواہوں

اور اس سے محبت کرنے والوں کو دارین کی خوشیاں عطا فرمائے  
اور ان سے اسلام و سنیت کی زیادہ سے زیادہ خدمات لے۔

امین بحبہ سید المرسلین

محمد وارث جمال قادری

۱۱، سوال المکرم ۱۴۰۹ھ

مطابق ۱۶ مئی ۱۹۸۹ء

# انجمنِ رضاءِ مصطفیٰ

یہ انجمن دراصل مدرسہ غوثیہ اہل سنت فیض العلوم پڑھیا کا ایک ذیلی شعبہ ہے جس نے مختصر سی مدت میں عسلا قانی طور پر مسلمانوں کے اندر دینی بیداری، ملی تڑپ، اور تصلب فی الدین کی لہر دوڑادی۔ یوں تو مدرسہ غوثیہ کو قائم ہوتے تقریباً پھیس برس ہوتے ہیں۔ اور اس کے زیر اہتمام ایک انجمن تھی جو اپنی باط کی حد تک طلب کے اصلاح و تربیت تک محدود تھی۔ پھر اس انجمن کو اسلام و سنیت کے ہمہ جہت خدمات کے لئے انجمن رضاءِ مصطفیٰ کی شکل دی گئی۔ جو.....

..... یادگار سلف حجۃ الخلف سید المحققین حضرت مولانا بدر الدین احمد قادری رضوی کی سرپرستی و نگرانی میں قائم ہوئی۔ شروع شروع میں فرزند ان مدرسہ غوثیہ مولانا محمد عارف مولانا سید افروز نوری، مولانا محمد شمیم قادری، مولانا محمد مستقیم خان محرم محمد وکیل بھگوت پوری، اور عزیز احمد خان نے بڑا کلیتہاً ہی دل ادا کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انجمن کے حسن خدمات نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اور اب تو پورے کارواں کا کارواں نے انجمن رضاءِ مصطفیٰ کو اپنے دل کی خوشگوار دھڑکنوں میں بسالیا ہے۔

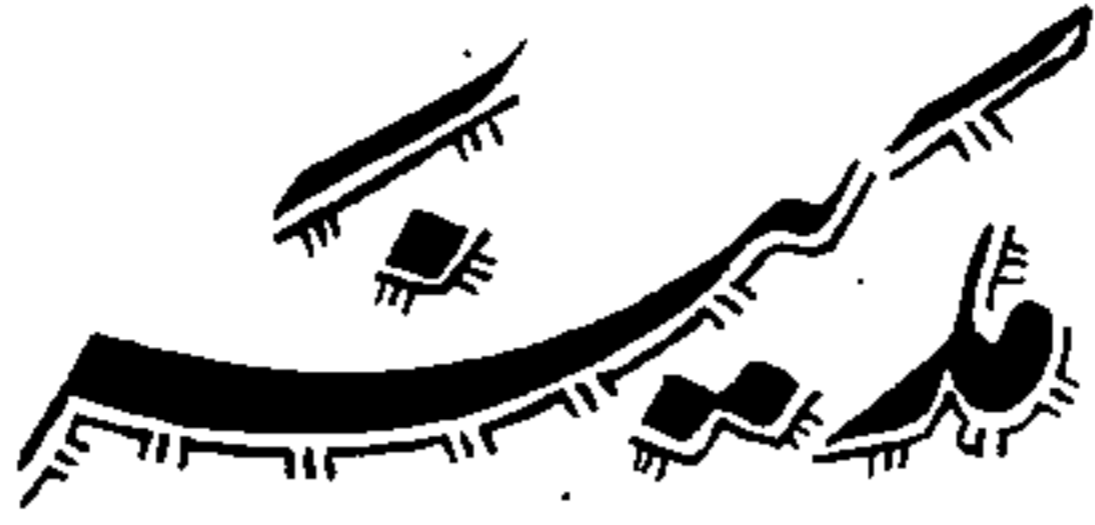


میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کاراں بنتا گیا  
 عبدالصمد خاں، مولوی غلام محمد خاں، ابرار احمد دھوبھی، مولانا  
 عتیق الرحمن فیضی، محمد مقبول کیتھولیا، زاہد خاں، عدیل خاں،  
 برادر م عتیق الرحمن صاحب وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے  
 انجمن رضائے مصطفیٰ کو اپنی دینی ضرورت سمجھ کر اس کے وجود کی افاد  
 کو پورے طور پر محسوس کیا۔ اور جب بھی انجمن کو ان کی ضرورت  
 پڑی تو انہوں نے اپنا کام کاج چھوڑ کر انجمن کے لیے دن رات ایک کر دیا۔  
 فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ انجمن رضائے مصطفیٰ بڑھیا کا ایک بڑا کارنا  
 سال میں ایک بار عظیم پیمائش دو روز دینی اجلاس کا انعقاد ہے۔ یہ  
 اجلاس بڑے تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس موقع  
 پر بڑھیا کی سرزمین پر ہر چہار جانب سے انسانوں کا سیلاب آمد  
 آتا ہے۔ جن کے انتظام و انصرام اور میزبانی کا سارا بوجھ مدرسہ غوثیہ  
 کے بجائے انجمن رضائے مصطفیٰ کے جوان حوصلہ ارکان کے کندھوں  
 پر ہوتا ہے۔ یہ اجلاس غالباً دینی اور مذہبی ہوتے ہیں، سیاست  
 حاضرہ کی آلودگیوں سے پاک اور مدائنت فی الدین سے کوسوں دور  
 اس میں نہ تو سیٹھوں کی قصیدہ خوانی ہوتی ہے اور نہ صلح کیوں  
 کی دلجوئی۔ اور نہ ہی بد مذہبوں کی کوئی رورعایت۔ اس تاریخی اجلاس  
 کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں چندہ کا کوئی دھندہ نہیں  
 ہوتا۔ اور نہ ہی اس میں کسی بد مذہب کی پذیرائی۔ خواہ وہ دنیوی  
 طور پر کتنا ہی بڑا صاحب اعزاز کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ فی زمانہ دہم ہتے  
 ہیں کے زغم باطل اور اپنے متعلق خود فریبی میں مبتلا بعض معاصر

ادارے کا یہی دھندا ہے۔ ان کے جلسے کی غرض و غایت اشاعتِ اسلام  
 و سنیت کم حصولِ زرمقصدِ ذریں ہوتا ہے۔  
 یاں دعاؤں کی فیس لگتی ہے  
 زرطے تو زبان بھلتی ہے

اس کے لئے ہر وہ راستہ اختیار کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔  
 اور اپنے زنبیلِ گدائی کی شکم پُری کے لیے اپنے وقار، عزتِ نفس،  
 حرمتِ سنیت، اور امتیازِ حق و باطل، سب داؤں پر لگا دیتے ہیں۔  
 مولیٰ عز و جلال اپنے حبیبِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ  
 وسلم کے طفیل ایسے اداروں کے اساتذہ و اربابِ بسط و کشاد  
 کی تطہیر فرمائے اور ان کے قلوب کو عظمتِ اسلام و سنیت  
 اور اخلاص فی الدین کے جذبوں سے بھر دے۔  
 رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف  
 آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

محمد وارث جمال قادری



## کارتنا عشق کی راہداری

انسانیت جان بلب تھی اور اس کا پیر بن خون اور آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کارتناات پر تاریکیاں مسلط تھیں۔ اور وحشت و بربریت کے خونی بگولوں نے اسے ہر طرف سے جکڑ رکھا تھا۔ گیتی کافر شش تیرہ و تار ظلمت کدوں میں بدل کر رہ گیا تھا اور مجسروح انسانیت زخموں سے چور تھی، تاریک رات کے مسافر کسی روشنی کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ کارتناات بھر کے بھٹکے ہوئے قافلوں کو کسی راہنما کی تلاش تھی۔ شام میں یہودی و عیسائی پیشوا یان مذاہب کی نگاہیں اپنے گرد و پیش سے مایوس ہو کر فلسطین کی وادیوں میں اس نجات دہندہ کی تلاش میں تھیں جس کی آمد کی بشارت ان کے آسمانی صحیفوں میں دی جا چکی تھی، ظلم و ستم، جبر و استبداد کی چکی میں پسے والی منظم سسکتی کراہتی انسانیت عدل و انصاف رحم و کرم کے لیے مضطرب تھی۔ درد کی ماری دکھیاری عرب کے باہر کی آبادی کے بہت سے لوگ رحمت ایزدی سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے۔ امن و آشتی صلح و محبت کے جویاؤں کی پھسرائی ہوئی نگاہیں کسی صبح سعادت کے انتظار میں تھیں۔ مگر جاہل، فدی، مغرور، خونخوار، جفا پیشہ عرب

کا ضمیر ہر طرح کی روشنی سے محروم تھا، اپنے مقدر کے ظلمتوں کے لیے کسی  
 روشنی کی ضرورت ہی نہیں محسوس کر رہے تھے وہ اپنے بدترین ماضی پر  
 مفتخر اور حال کی پستیوں پر مغرور و مگن تھے۔ ہر وہ شاہراہ جس پر اسلاف  
 کے نقش قدم نہ تھے ہرگز قابل قبول نہیں تھے وراثت میں پائی جانے  
 والی ہر برائیوں کے امین اور اس کے محافظ تھے ان کا وجود زندگی کی  
 ہر سعادت کی نفی کرتا تھا۔ وہ اپنے ظلمتکدے کو ہر طرح کی روشنی سے محفوظ  
 رکھنا چاہتے تھے مگر یہی وہ ظلمتکدہ تھا جو امن و شانتی اور روشنی کے متلاشیوں کا  
 مرکز بننے والا تھا، یہی وہ بنجر اور سنگلاخ زمین تھی جسے قدرت نے اپنے احسانات  
 و انعامات کی موسلا دھار برسات کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ  
 شربِ بوجہا و بربریت، نفرت و حقارت، وحشت و انتقام نسلی قبائلی اور خاندانی عصبیتوں  
 کی آماجگاہ تھا۔ معمولی باتوں پر خون کا دھارا بہا دینے والی زمین جہاں وحشت و بربریت  
 کے عفریت انسانی خون کی اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے، امن و سلامتی، رحم و کرم، صلح و  
 آشتی، محبت و اخوت کا سب سے بڑا گہوارہ بنے گی۔ نسل در نسل انتقام  
 کے شراروں کی جگہ محبت و اخوت کے چشے اُبلیں گے، فاران کی چوٹیوں  
 سے طلوع ہونے والے آفتاب رسالت کی ضیا پاشیوں کے سب سے  
 زیادہ مستحق اسی کے در و دیوار ہوں گے، ارض و سما کی ساری نعمتیں  
 برکتیں اور سعادتیں اس کا مقدر بن جائے گی۔ یہ سر زمین روئے  
 زمین کے بے بسوں بیکسوں، مجبوروں، فلاکت زدوں کی امید بن  
 جائے گی۔ اس زمین کے فرش پر بیٹھنے والے مہمیں ایوانوں میں  
 رہنے والے کج کلاہوں کے قسمتوں کا فیصلہ کریں گے۔ جہاں کے  
 مکین شکوہ قیصر اور سطوت کسریٰ کو اپنے قدموں سے روندیں

گے جہاں کے فرش نشین اللہ کی عظمت و جلال اور اس کی کبریائی و جبروت کا پرچم چھاؤنگ عالم میں لہرا دیں گے۔ وہی شرب جس کا غلغلہ شرق سے غرب، جنوب سے شمال اور فرش سے عرش تک مچا ہوا ہے۔ دنیا کے نقتے تو درکنار خود عرب میں بھی اسے لائق اعتناء نہیں سمجھا جا رہا تھا۔ جب کفر و شرک، جہالت و بربریت کی دبیز تازیکیوں کو چیرتے ہوئے رسالت کا آفتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا اور وادی بطن نبوت کی ضیا پاشیوں سے تابناک ہوئی۔ اہل مکہ پر مظلوم سسکتی انسانیت کے نجات دہندہ نبی رحمت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے اسلام کی دعوت پیش کی تو غریبوں، مسکینوں، مظلوموں، غلاموں، کینروں اور چن چن قابل ذکر نفوس کی ایک قلیل تعداد کے علاوہ اہل مکہ کی اکثریت نے نبی رحمت علیہ السلام کی دعوت کو مسترد کر دیا۔ نہ صرف مسترد بلکہ پیغمبر امن و امان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء کے ایسے درپے آزار ہوئی کہ ان پر ان کا عرصہ حیات تنگ کر دیا مسلسل تیرہ برس تک دن رات کی جدوجہد اور جانکاہ مشقت کے باوجود اہل مکہ کا کفر و طغیان، عداوت و دشمنی، ترم و سرکشی، خباثت و کج روی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بے شکستہ خاطر کر دیا جس پر انسانیت کے محسن اعظم نے اپنے رب کے حکم سے شرب کو تبلیغ کے لیے مستقل ایک نیامیدان منتخب کیا۔ اپنے رفیقوں اور جاں نثاروں کو پہلے ہی سے اجازت دے رکھی تھی کہ اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے مکہ چھوڑ دیں اپنے آبائی وطن کو بے سروسامانی کے عالم میں ہمیشہ کے لیے چھوٹے وقت ان جاں نثاروں کو جن صبر آزمایوں سے گزرنا پڑنا۔ اسکی تفصیل

بہت دردناک ہے۔

یثرب جو ابھی تک عرب کے نقشے پر کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکا تھا۔ مشیتِ ایزدی اس کی ارجبندی کا فیصلہ کر چکی تھی، خاکِ یثرب کو ثریا کا اوج، کہکشاں کا جمال، چاند کی چاندنی، ستاروں کی تابانی، پھولوں کی مہک، غنچوں کا تبسم، کلیوں کا نکھار اور آبشاروں کا ترنم، ملنے والا تھا، صبحِ قیامت تک چہار دانگِ عالم میں اس کی شوکت و عظمت کا غلغلہ بلند ہونے والا تھا۔ ابھی یثرب کی مٹی کو خاکِ طیبہ کا خطاب نہیں ملا تھا۔ ابھی اس نے بڑھ کر قدم ناز کا بوسہ نہیں لیا تھا۔ مگر گھر گھر گلی گلی، فرد فرد کی زبان پر یہی تذکرہ تھا کہ جلد ہی خدا کا آخری اور مقدس رسول بیدار بختیوں کی ایک نئی دنیا لے ہمارے اندر ہمیشہ کے لیے رونق افروز ہونے والا ہے ہر شخص دیدہ و دل فراس راہ بنا ہوا ہے۔ ساری آبادی سراپا انتظار ہے۔ خوش بختیوں کی معراج ہونے والی ہے۔ ہر شخص چشمِ تمنا لیے ہوئے آرزوں کی بارات سجائے تمناؤں کے ناپید انار و سعتوں میں غوطہ زن ہے۔

خوشا نصیب ایک دن ساری آبادی چونک پڑتی ہے۔ دلی خوشگواؤں دھڑکنوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ مسترتوں کا ایک ہیجان انگیز تلاطم ہے۔ آرزوئے شوق کی گھاگھی ہے۔ ایک شادی کی سی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ کسی نے ان کے سوکھے کانوں میں یہ ملکوتی نغمہ کھول دیا ہے۔

» انسانیت کا نجات دہندہ ابوبکر کی رفاقت میں مکہ چھوڑ چکا ہے خفیہ طور پر پھلتے چلائے چھپتے چھپاتے راستہ بدلتے کسی بھی وقت وہ یثرب میں نزولِ اجمال فرما سکتا ہے «

بس ابھی سے دلوں کا عالم زیر و زبر ہونے لگا۔ افراد اشتیاق اور جذبہ شوق کی گھاگھی میں آبادی آبادی کو چھوڑ چھوڑ کر باہر آجاتی کہ کب وہ رحمت و نور، الطاف و کرم اور جمال و جلال کا پیکر مجسم، دلنواز تبسم کے ساتھ ہمارے دلوں کے فرش کو عزت بخشے۔ جب سے ان جہنم جنم کے پیاسوں نے سنا کہ عزتوں، حرمتوں، عظمتوں، بخششوں، رحمتوں اور ہدایتوں کا چشمہ سیال راستے کے ہر تشنہ لب کو سیراب کرتے منزل بہ منزل نہایت تیزی کے ساتھ ہم کو اپنے آغوش رحمت میں لینے کے لیے ہماری ہی طرف بڑھا چڑھا آ رہا ہے ان کی تشنگی دوچند ہو گئی۔

بالآخر ایک دن رحمتوں کا سویرا ہوا گلِ قدس کی خوشبو آڑی، روح کی بہاروں کا رت بدلی۔ خوش بختیوں کا اجالا ہوا۔ اہل شرب چیخ اٹھے لو! انسانیت کا نجات دہندہ اللہ کا آخری برگزیدہ اور مقدس رسول، بیدار بختیوں اور اقبال مندیوں کا امین بن کر ہم میں جلوہ افروز ہو گیا۔ اب کیا تھا ہر طرف خوشیوں کا چشمہ سیال اُبلنے لگا۔ بہت و مسرت کے شادیاں بچنے لگے۔ چھوٹے بڑے، بچے بوڑھے، مرد عورت۔ آج کسی کی خوشیوں کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں۔ یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی اچھلنے کودنے لگیں اور معصومانہ لے میں اپنی اپنی دفوں پر خوشیوں کا ساز چھیر دیا۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوُدَاعِ

ہم پر چود ہوئے کا چاند ثنیات الوداع (لوگوں کے رخصت کرنیکی جگہ) سے طلوع ہوا۔

وَجَبَّ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلَّهِ دَاعِ

ہم پر اللہ کا شکر واجب ہو گیا جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگتے ہیں۔

أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِينَا جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمَطَاعِ

اے وہ ذاتِ گرامی جو ہم میں بھی گئی آپ ایسے دین کو لائے جو لائقِ اطاعت ہے۔

أَنْتَ شَرَفْتَ الْمَدِينَةَ مَرْحَبًا يَا خَيْرَ دَاعِ

آپ نے مدینے کو شرف و بزرگی بخش دی اے بہترین دعوت دینے والے

تو آپ کے لیے خوش آمدید ہے مرحبا ہے۔

فَلَيْسْنَا ثَوْبَ يَمِينٍ بَعْدَ تَلْقَائِنِ الرَّقَاعِ

پس ہم نے یمنی کپڑے پہنے جبکہ اس سے پہلے یونان کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

فَعَلَيْكَ اللَّهُمَّ صَلَّى مَا سَعَى لِلَّهِ سَاعِ

پس آپ پر اللہ عز و جل اس وقت تک تمہیں نازل فرماتا رہے جب تک کوشش

کرنے والے کوشش کرتے ہیں۔

اور پھر اس محسنِ انسانیت، معلمِ کائنات آقائے دو جہاں صلی اللہ

تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہ و صحبہ و بارک و سلم نے خاکِ یثرب کو اپنے قدم

میں منتازوم سے سرفراز فرماتے ہوئے اب تک کے یثرب کو ہمیشہ کے لیے

مَدِينَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے بدل دیا اور ارشاد

فرمایا اب آج سے کوئی اسے یثرب نہ کہے۔

بلکہ یہ مَدِينَةُ نَبِيِّهِ

اور جب یثرب مدینہ سے بدل گیا تو اس کے لیے عشاقانِ بارگاہ

رسالت نے کیسی کیسی آرزوؤں کی بارات سجائی ہے۔ بھگی ہوئی پلکوں

کی چلمن سے ذرا ان آرزوؤں کے شوق کا تماشہ تو دیکھیں

یہ نہیں کہ خلد نہ ہونکو وہ نکوئی کی بھی ہے آبرو

مگر اے مدینہ کی آرزو جسے چاہے تو وہ سماں نہیں

(الرحمن الرحیم)



آرزوئے جنت الماویٰ بروں کردن ز دل  
جنم آیں بس کہ بر خاکِ دُرت ماویٰ کنم

(مولانا جامی)

خاکِ طیبہ از دو عالم خوشتر است  
اے خنک شہرے کہ دُرتے دلبر است

(ڈاکٹر اقبال)

اُن کی حرم کے خار کشیدہ ہیں کس لیے  
آنکھوں میں آئیں سر پہ رہیں نہیں گھر کریں

(اعلیٰ حضرت)

طیبہ میں مرنے کے سیدھے چلے جاؤ آنکھیں بند  
سیدھی سڑک یہ شہر شفاعت تگر کی ہے  
عاصی بھی ہیں چہتے یہ طیبہ ہے زاہد  
مکہ نہیں کہ جانچ بہتاں خیر و شر کی ہے  
پھول تو پھول میری آنکھوں میں  
دشتِ طیبہ کے خار پھرتے ہیں

(اعلیٰ حضرت)

مر کے جیتے ہیں جو تیر درد پہ جاتے ہیں حسن  
جی کے مرتے ہیں جو آتے ہیں طیبہ چھوڑ کر  
کون کہتا ہے کہ زینتِ ثلحہ کی اچھی نہیں  
لیکن اے دلِ فرقت کوئے نبی اچھی نہیں

(علامہ حسن)

مدینہ کی زمیں بھی کیا زمیں معلوم ہوتی ہے  
لئے آغوش میں عرشِ بریں معلوم ہوتی ہے  
تعالیٰ اللہ اے ارضِ مدینہ تیرا کیا کہتا  
باندی عرش کی زیر زمیں معلوم ہوتی ہے

رِحْدَاتِ اعْظَمِ سَيِّدِ كُنْهِ نَجْوَى

طیبہ نہ ہی افضل مگر ہی بڑا زاہد ہم عشق کے بندے ہیں کیوں بات ٹھانی

(اعلیٰ حضرت)

خست میں خاک بوسے طیبہ کی لے رہا ٹیکا جو چشم بہرے وہ خون نابت ہوں

(اعلیٰ حضرت)

اس در کی صفوی ہی عصیا کی دو اٹھی ہے زہر معاصی کا طیبہ ہی شفا خانہ

مفتی اعظم ہند

کسی نے لی رہ کعبہ کوئی گیا سوئے دیر

بڈے رہے ترے بندے مگر ترے ذہ پر

اخیر وقت ہے آسی چلو مدینہ کو

تیار ہو کے مرو تربت پیمبر پر

رسول کا اسی

حرم کعبہ میں بھی یاد آئی طیبہ کی

کہ یادگار حرم میں ہے کو یہ کو تیری

دشت طیبہ ہے یہاں چل سر کے بل لے اعظمی

مصطفیٰ کا جنتی در بار تھوڑی دور ہے

(بیت المقدس اعظمی)

یہ کعبہ ہے یہاں دیوانگی بھی حسن ایماں ہے

اگر طیبہ میں دامن ہاتھ سے چھوٹا تو سب چھوٹا

تلاش نقش کف پائے مصطفیٰ کی قسم

چنے ہیں آنکھوں کے ذرات خاک کو تے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

(بیت المقدس)

نام مدینہ لے لیا چلنے لگی نسیم خلد

سوزش غم کو ہم نے بھی ایسی ہو اچلائی کیوں

(اعلیٰ حضرت بریلوی)

اوپائے نظر ہوش میں آگئے نبی ہے  
آنکھوں سے یہاں چلنا بھی بے ادبی ہے

مدینہ جاؤں پھر آؤں اور پھر جاؤں  
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

مسلمان تو مسلمان ہندو شعراء بھی مدینہ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یوں عرض کناں ہیں۔ فکر کی طہارت  
جدبات کی صداقت اور الہانہ عقیدت ملاحظہ ہو

یہ ارض مقدس ہے یہ طیبہ کی زمیں ہے  
جنت بھی یہیں مالک جنت بھی یہیں ہے  
اے خاک مدینہ ترے اعزاز کے صدقے  
جو عرش نشیں ہے وہ یہاں فرش نشیں ہے

(چند لہجہ لکاش)

(نور ہجرت)

دل جو ہے ہمارا مدینے کی سیر میں

گھر بیٹھے ہو رہا ہے زیاد رسول کی

(دائیں شورنا پیش الہ آبادی)

کافر نہ کہو شاد کو ہے عارف و صوفی

شیدائے محمد ہے وہ شیدائے مدینہ

یہ ربط نبوت اور وحدت ہر حال میں یکساں ہوتا ہے

جھکتی ہے جسیں کعبہ کی طرف اور دل میں مدینہ ہوتا ہے

دہر رحمت پہ حاضر ہیں شفاعت چاہنے والے

بڑی حسرت سے امید شفاعت کے آئے ہیں

جب کبھی جاتے ہیں بل کر سوئے طیبہ خوش نصیب

کارواں کے ساتھ گرد کارواں ہوتا ہوں میں !

(دکنور ہندو سنگھ)

(بیدی سحر)

میں اگر خاک نشینِ ذرا احمد ہوں گا  
 رفعتِ عرش کے ہمسرِ مری بستی ہوگی  
 جیتے جی روضہِ اقدس کو نہ آنکھوں دیکھا  
 رُوحِ جنت میں بھی ہوگی تو ترستی ہوگی

\_\_\_\_\_ (منشی شکر اللہ ساقی)

جی چاہتا ہے کوچہ انوار میں چسکوں  
 اپنے رسولِ پاک کی سرکار میں چسکوں

\_\_\_\_\_ (پنڈت ہری کشور شرمانظر)

# مجمع البحرین

وادی نیل کے کنارے ”طحا“ نام کی وہ آبادی جہاں مستروں کے  
 ایشارے قبہوں کے نغمے پھوٹا کرتے تھے۔ عالم سرخوشی  
 میں کیف و مستی کے چشمے اُبلتے تھے۔ نوردنکھت میں ڈوبی فضائیں  
 رنگ و آہنگ کی سرمستیاں، جمال و رعنائی کی مہتابیاں ہر طرف سے پھوٹی  
 محسوس ہوتی تھیں، آج بہت سوگوار ہے۔ فضاؤں میں بھی حزن و ملال  
 اور غم کی ایک چادر سی اتنی ہے۔ سوگوار کی کیفیت سے ماحول تک بوجھل  
 ہو گیا ہے۔ ایک طرف کرب آلود سکوت — ایک غمناک سناٹا —  
 دریائے نیل کی خاموشی سے پتہ چلنا ہے کہ وہ بھی بستی والوں کے غم میں  
 برابر کا شریک ہے۔

کارگاہ حیات میں زندگی اور موت تو ایک عام سی بات ہے۔  
 زندگی کی پہلی آواز ہی اس بات کی دلیل ہے کہ سائر حیات کے اس  
 تار کو ٹوٹنا ہے۔

زندگی کیا ہے غماہ میں ظہورِ ترتیب موت کیا ہے انھیں جزا کا پریشان کرنا  
 زندگی اور موت کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس دنیا میں ہزاروں کی  
 تعداد میں لوگ آنکھیں کھولتے، بست کرتے ہیں۔

لانی حیات آئے قضا لے چلی چلے  
 اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

جس پر کسی کو حیرت ہے اور نہ تعجب ! کتنے ہی دارا و سکندر آئے اور  
چلے گئے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

کتے ہی نہ دشمنوں، لالہ رخنوں، مہ جبینوں، گل بدنوں کا سورج چمکا  
دلوں کی وادیاں زیر و زبر ہوئیں، خون کی ندیاں بہیں، ہزاروں گردنیں  
کٹیں، خرام ناز کی حشر آفرینی سے ایک عالم تہ و بالا ہوا۔ مگر شہر خوشاں  
میں کسی بھی گوشے میں ڈور ڈورت تک اُن کا نام و نشان نہیں ملتا۔

مگر نہیں! انھیں ہزاروں لاکھوں زندگیوں میں کسی کی موت  
اور زندگی ایک ایسا حادثہ بن جاتی ہے کہ جس کی یادوں کے سائے سے  
دامن بچانا بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا حادثہ » طحا « نام  
کی اس بستی میں محمد بن سلامہ کی بیوی کو بھی پیش آتا ہے۔

بستی کی بڑی بوڑھیاں اور تجربہ کار دائیاں اپنی کوششیں کر کے  
تھک بار گئیں۔ مسلسل گھنٹوں زندگی اور موت کی کشمکش میں زندگی  
کوشکت نصیب ہوئی۔

پھر آج کسی سوچ میں ڈوبے ہیں درو بام

کیا جانئے کیا حادثہ بستی میں ہو اسے

گھر سے باہر تک صف ماتم بچھ گئی۔ محمد بن سلامہ پر جیسے بجلی گر پڑی جس  
شاخ کے سہارے وہ اپنا نشیمن تعمیر کرنا چاہتا تھا، وہ شاخ ہی ٹوٹ گئی۔  
مستقبل کے سارے منصوبے ایک خواب پریشاں ہو کر رہ گئے۔  
غم زندگی سے اجر گئیں وہ تصویر کی محفلیں کبھی شام غم بھی عزیز تھی مگر اب سحر کی تلاش

ہاتے رہے بے بسی! زندگی کے ہر موڑ پر ہر دکھ سکھ کی سائقی، رفیقہ حیات،  
زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہو رہی ہے، پاس رہ کر بھی آخری ملاقات  
سے محرومی ہے

ہاتے رہے انسان کی مجبوریاں  
پاس رہ کر بھی ہیں کتنی دوریاں

جرمان نصیبی کا یہ عالم کہ ارد گرد اظہارِ تعزیت اور دم دلا سے کہنے  
بھی کوئی موجود نہیں۔ اتنا ہوش بھی کسے ہے، کیونکہ بچہ مرنے والی  
ماں کے پیٹ کے اندر رہی ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ پر سوالیہ نشان بنا ہوا  
ہے » اب کیا ہوگا « مرنے والے کی کسی عزیزہ نے آنسو بہاتے ہوئے  
کہا » ہو گا وہی جو ارحم الراحمین کی مرضی ہوگی۔ ہمارے  
دیکھتے دیکھتے ایک زندگی کا چراغ گل ہو گیا اب دوسری زندگی بچانا  
ہمارا فرض ہے « ان میں ایک تجربہ کار بڑھیا نے جواب دیا۔ کوشش  
اپنا کام نتیجہ رب کے دستِ قدرت میں! ان آنسوؤں کو صانعِ کونے  
سے بہتر ہے کہ انھیں اپنے رب کے حضور بہاؤ اور زندگی اور موت کے  
مالک سے اس دوسری زندگی کی بھیک مانگو « دوسری زندگی کون  
کیا صدقات نے تمہارے دماغ الٹ دیئے ہیں، دیکھ نہیں رہی  
ہو کہ یہ جرمان نصیب پورے دلوں سے تھی۔ بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں  
زندہ ہے خدا سے دعا کرو ہمیں وہ دوسری زندگی بچانے میں کامیاب فرمائے  
بڑی احتیاط کے ساتھ ماں کا پیٹ چاک کیا گیا اور کافی جدوجہد  
کے بعد ارد گرد کھڑی عورتوں کو بچے نے بڑی نجف اور کمزور آواز کے

۲۳  
ساتھ اپنی زندگی کا احساس دلایا ہے

امید کی مدہم سی اک نو ہو تو پیاری ہے

یہ ایک کرن تنہا ظلمات پہ بھاری ہے

عالم سرخوشی میں ایک معتر عورت باہر نکلی

سلامہ کے بیٹے اب ان سب آنسوؤں کو پونچھ ڈالو، تمھاری

آرزوؤں کی جنت، حاصل تمنا خلد آشیانی شریک حیات نے جاتے

جلتے تمھارے چہرے کی شادابی اور غمناک ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی

واپسی کا انتظام کر دیا ہے۔ بڑا خوبصورت اور یادگار تحفہ ایک بیٹے

کی شکل میں چھوڑ گئی ہے جو تمھاری شبستانِ محبت کا ایک خوبصورت

پھول ہے۔

غموں کے ان کربناک لمحوں میں خوشی کی یہ سوغات بہت حد تک

تمھارے غموں کا مداوا کر سکتی ہے۔ تمھیں یہ مسعود بیٹا مبارک ہو۔

جنتِ مکانی کے اس امانت کو اپنی امیدوں کا مرکز بنا کر ماں باپ

دونوں بن کر تمھیں اس کی پرورش کرنا ہے۔ خدائے ذوالجلال تمھیں

صبر جمیل اور تمھارے حوصلوں کو توانا عطا فرمائے۔

بیوی کو سپردِ خاک کرنے، اپنی تشنہ کام حسرتوں، تمناؤں اور

آرزوؤں پر اپنے ہاتھ سے مٹی ڈالنے کے بعد جب محمد بن سلامہ نے گھر

آکر بیٹے کو گود میں لیا تو اسکی آنکھیں بہنے لگیں! یہ بچہ اپنی ماں کے

گود میں کتنا اچھا لگنا! کاش! اس بد نصیب کو چند ہی لمحوں کا موقع

مل جاتا کہ اسے دیکھ کر اپنی پیاسی آنکھیں سیراب اور کلیجے سے لگا کر

دل کی دھڑکنوں کو سکون دے لیتی ہے



غنچے چپ ہیں گل ہے ہوا پر کس سے کہئے دل کا حال  
 خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگانہ بھی  
 جب بھی محمد اپنے بیٹے کو اپنی آغوشِ محبت میں لیتا، دل پر ایک چوڑی  
 پڑتی۔ جانے کہاں سے بہت سارے درد جاگ اٹھتے۔ یادوں کے قافلے  
 جوق در جوق ذہن کے دریچوں پر دستک دینے لگتے اور شریکِ حیات کے  
 ساتھ بیٹے ہوئے خوشگوار لمحے ایک آزار کی شکل اختیار کر لیتے  
 اپنی سانسوں میں ہے ہر دم تری یادوں کی ہلک  
 پھر بھلا کیسے تجھے دل سے بھلائے رکھیں  
 بچے کی پرورش، سعیِ معاش، فکرِ امروز و اندیشہاے فردا سے چین نہیں  
 لینے دیتے، انسانی فطرت کے مطابق شفقتِ پدری سے وہ مالا مال تو  
 تھا مگر ماں کا وہ دل پُر اضطراب اور بےقراریاں کہاں سے لانا جو بات بات  
 پر اپنے بچے کے لیے تڑپ اٹھتا ہے

آج احساس ہوا ہے مجھے تنہائی کا

ماں کی شفقتوں کی ٹھڈی چھاؤں، مٹا کی بے چینیوں کی نرم دھوپ،  
 اور گداز پلکوں کے سائے سے محروم وہ تہاں نصیب پروان چڑھنے لگا۔  
 عمّت بن سلامہ بیٹے کا ہر ناز اٹھاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ و نجوم کی گردش  
 نے بچے کو زندگی کے اس اسپنج تک پہنچا ہی دیا جہاں سے شعور و آگہی  
 کا قرینہ حاصل کیا جاتا ہے۔

اس کا قد تو عام بچوں ہی کی طرح تھا مگر ذہنی نشوونما کے معاملے میں  
 اپنے عموں سے بہت آگے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی ہی میں ابتدائی تعلیم مکمل  
 کر کے مشہور زمانہ شافعی فقیہ حضرت شیخ ابراہیم مزنی کے درس گاہ

کے لائق ہو چکا تھا۔

بچپن میں تو تدمبوسس ہیں لاکھوں فتنے  
رفتہ رفتہ تیری رفت ارقیامت ہوگی

تیسری صدی کے نصف آخر میں حضرت ابو جعفر احمد بن ابی عمران  
موسیٰ کی علمی جلالت کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا۔ ان کے علم کی  
خوشبو سے ایک عالم مشکبو ہو رہا تھا۔ بھینی بھینی، پیاری پیاری خوشبو  
سے سعید رو میں کیف بار ہو رہی تھیں۔ تشنگانِ علوم کے لیے ان کی  
درسگاہ ایک چشمہ سیتال کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ان کے علمی فیض کا  
سیل رواں اس راہ کے ہر نشہ لب کو سیراب کر رہا ہے۔ ان کی علمی عظمتوں  
فکری رفعتوں اور بیکراں ذہنی بلندیوں کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آپ کی نسبت

تمذ امام الائمہ، سراج الائمہ، فخر عجم، رشک عرب حضرت ابو حنیفہ النعمان  
سے متصل ہے۔ آپ شاگرد ہیں حضرت محمد بن سمان کے وہ تلمیذ رشید  
ہیں قاضی القضاة حضرت امام ابو یوسف کے اور حضرت امام ابو یوسف امام  
اعظم ابو حنیفہ کی جلالت علمی، اصابت فکر کے منظر اتم اور آپ کی فقہی عبقریت  
کے شاہکار اعظم ہیں۔ اس نسبت کرامت نے آپ کے علمی شکوہ میں جا  
چاند لگا دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے تشنگانِ علوم کا جمگھٹا آپ کی  
درسگاہ میں رہنے لگا۔ دور دراز مقام سے طالبانِ شوق کا قافلہ جوق  
درجوق اتار رہتا۔

روایت دیرینہ کے مطابق درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے اپنے  
اپنے ظرف و حوصلے کے مطابق ہر شخص علم کے اس بیکراں بحر سے اپنا  
حصہ لینے میں مصروف ہے علوم و معارف کے وہ خزانے جو اپنے اساتذہ

سے ملے تھے۔ بڑی فیاضی کے ساتھ مستحق باوصلہ اور اہل تلامذہ کو تقسیم فرما رہے ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب، معانی، بلاغت کا آبشار ہر تشنہ کام کو شاد کام کر رہا ہے۔ کہ اسی اثنا میں ایک اجنبی نے باریابی کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر بڑے ادب اور قرینے کیساتھ ایک نوخیز لڑکے نے درگاہ میں قدم رکھا۔ آثار مسافرت کے باوجود پہرے پر بڑی دلاویزی تھی، تیکھے نقوش، بھیگی ہوئی مسیں، آنکھوں میں ذہانت کی مخصوص چمک بلند اور کشادہ پیشانی سے اقبال مندی کے ہویدا آفتاب سے

بالائے سرش زہوش مندی

می تافت ستارہ بلندی

کا مکمل مصداق تھا۔ چند ساعتوں کے لیے شیخ و تلامذہ کے نگاہوں کا مرکز توجہ بنا رہا۔ سلام و دعا کے بعد حضرت شیخ ابو جعفر نے پوچھا۔

” صاحبزادے کہاں سے آرہے ہو؟“

” شیخ مزنی کی بازگاہ سے“ آنے والے نے بڑی متانت اور شائستگی

سے جواب دیا۔

” کون! ابن اہم مزنی؟“

جی ہاں۔ کیا آپ ان کو جانتے ہو؟

” بہت اچھی طرح سے وہ شافعی مسلک کے زبردست عالم اور صاحب

نسبت بزرگ ہیں ان کے مزاج تو بخیر ہیں“

” الحمد للہ! وہ ہر طرح سے بخیر و عافیت ہیں۔ البتہ ان کی نظر میں میری

ہی خیریت خطرے کی زد پر ہے!!“

”صاحبزادے بات کیا ہے؟ کچھ اکھڑے سے نظر آتے ہو؟“

”سرکار عالی! بات ہی ایسی ہے۔ آج سے پہلے میں شافعی مسلک پر تھا،

”کیا مطلب؟ کیا اب تم شافعی مسلک پر نہیں ہو؟“

وہی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے میں شافعییت کو ماموں

جان کی درسگاہ میں چھوڑ آیا ہوں۔“

”کون مامو جان؟ کیا تم ابو ابراہیم مزنی کے بھانجے ہو؟“

”جی ہاں! اس گنہ گار کو ان کا بھانجہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔“

”سبحان اللہ! بڑی خوشی ہوئی کہ علی خانوادے کے چشم و چراغ ہو۔ اچھا

درس ختم ہونے کے بعد تم مجھ سے تفصیلی ملاقات کرنا اور پھر قال اللہ

وقال الرسول کی صدماتے زمزمہ نواز بلند ہونے لگی۔

درس ختم ہونے کے بعد شیخ ابو جعفر نے کوچہ طلب کے اس نواز

کو طلب فرمایا۔ سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے فرمایا ”بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟“

”احمد“

”بہت خوب! میرے ہی ہمنام ہو! مجھ سے پڑھنا کیا چاہتے ہو؟“

”فقہ حنفی“

”فقہ شافعی کی تکمیل ہو گئی؟“

”نہیں! ماموں جان کی درسگاہ میں فقہ شافعی ہی کی تکمیل کا ارادہ

تھا مگر اب میں فقہ حنفی کا عالم بننا چاہتا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ میں اس میں

کمال حاصل کروں۔ حالانکہ ماموں جان یہ فیصلہ دے چکے ہیں کہ بجز اتنو

زندگی بھر فقیہ نہیں بن سکتا۔“

”بیٹے! اب میں تمہارے تبدیلی مسلک کی تفصیل جاننا چاہوں گا اگر

تم مجھے مطمئن کر سکتے تو میں بڑی خوشی کے ساتھ اپنی درسگاہ میں بیٹھنے کی اجازت دے دوں گا۔

» میں اصل واقعہ کی تفصیل گوش گزار کرنے کے لیے خود ہی بے چین ہوں۔ ہوا یوں کہ حسب معمول ماموں جان کا درس جاری تھا کہ اثنائے درس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اگر کوئی حاملہ عورت وضع ولادت سے قبل ہی مر جائے اور اس کے پیٹ میں بچہ زندہ ہو تو کیا کیا جائے؟ آیا بچہ کے ساتھ بچہ بھی دفن کیا جائے گا یا ماں کا شکم چاک کر کے بچہ کو پچایا جائے گا؟

حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ کا یہ مسلک ہے کہ بچہ کو پچانے کے لیے ماں کا شکم چاک نہ کیا جائے بلکہ ماں کے ساتھ بچہ بھی دفن کر یا جائے۔ یہ جبکہ امام الائمہ سراج الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ نہیں! اگر واقعی بچہ ماں کے پیٹ میں زندہ ہو تو اس کو پچانے کے لیے ماں کا شکم چاک جائے گا۔ اس کو ماں کے ساتھ قبر میں دفن نہیں کیا جائے گا۔

حضرت امام شافعی کے اس مسلک کا حال معلوم کر کے مجھے بڑی وحشت اور سخت صدمہ ہوا۔ میں نے اس مسئلے پر مسلسل اعتراضات اور شدید اختلاف کیا کہ کیا ایک ایسی جان جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے وجود بخش کر اسے تکمیل فرمایا ہو۔ یہ اس پر ظلم نہیں؟ اور کیا یہ اس کا قتل عمد نہیں؟ عالم غضب میں میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں ایسے شخص کے مسلک ہی سے راضی نہیں جو میری ہلاکت پر راضی ہو۔ میری ولادت سے قبل میری ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت امام اعظم کے بے غبار مسلک پر میری والدہ مرحومہ کا شکم چاک کر کے مجھے حیات نو عطا کی گئی۔ جبکہ شافعی مسلک

میری بخت مکانی والدہ ماجدہ کے ساتھ میرا بھی فاتحہ پڑھ چکا تھا سہ

وہ آئے ہیں پشیمان لاش پر اب

تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ماموں جانِ فطرتِ انسانی کے اس جائز مطالبے کو تسلیم کر کے مجھے تسکین  
مرحمت فرمانے کے بجائے بھڑک اٹھے اٹھا مجھ کو موردِ الزام قرار دینے لگے اور  
قہر و غضب میں ڈلنے لگے ہوئے فرمانے لگے ”ارے گستاخ و بے ادب تیری  
جرات کہ اتنے عظیم امام اور صاحبِ فضل و کمال پر تو یہ اعتراض کرتا ہے جس کی  
ذہانت، نقاہت اور علمی جاہ و جلال کا شہرہ اکنافِ عالم میں پھیلا ہوا ہے  
چھوٹا منہ بڑی بات! توبہ کر اور حضرت امام کی روح سے معافی مانگ۔“  
”اس میں توبہ اور معافی کی بات کہاں سے آگئی؟ حضرت امام اور  
ان کا علم و فضل، زہد و تقویٰ، عمقِ فکر، اصابتِ فکر، ذہانت و طانت،  
دانش و بینش الغرض تمام تر فضل و کمال کے باوجود وہ ایک فقیہ اور مجتہد  
ہیں۔ خطائے اجتہادی کا امکان بہر حال ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کا ہر  
اجتہاد درست، صائب اور قابلِ قبول ہی ہو جیسے اسی مسئلے کو لے لیں جو  
انسانی فطرت سے قطعی میل نہیں رکھتا۔ ویسے ان کی حسن نیت اور اجتہاد  
کوششوں میں اگرچہ خطائے اجتہادی ہی کیوں نہ ہو اس کا اجر عظیم ان  
کے رب کے یہاں تو محفوظ ہی ہے۔“

”ارے نالائق اگر تیری یہی کٹ جتنی رہ گئی تو تو پڑھ چکا اور بن چکا

فقیہ۔ اپنے ذہن و فکر کی اصلاح کر نہیں تو بخدا تو زندگی بھر فقیہ نہیں بن سکتا۔“

”فقہ شافعی سے مجھے کوئی کد نہیں ہے۔ حضرت امام شافعی کی سیرا

شخصیت کے احترام سے آج بھی خانہٴ دل معمور ہے امت مسلمہ پر ان کے

بے پایاں احسانات ہیں۔ ارباب علم و فن کی فہرست میں ان کی عظیم شخصیت  
اپنے پورے وقار کے ساتھ موجود ہے۔

مگر اس مسئلے میں مجھے دنیا کی کوئی طاقت، کوئی دلیل، کوئی برہان،  
مطہن نہیں کر سکتی۔ میں اس نازک ترین مسئلے میں بے حد جذباتی ہو گیا ہوں  
جو اب عرض کر دیا کہ مجھے ایسی فقہارت اور ایسا مسلک نہیں چاہئے جس میں  
ہم جیسے سیکڑوں ہزاروں انسانوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں آج ہی  
سے شافعی مسلک سے دستبردار ہو رہا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے سلام عرض کیا  
اور کھینگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ان کی درگاہ سے نکل آیا۔

درود یوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

بڑی شہرت سن کر حضور والا کی بارگاہ کرم میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ  
علیہ الرحمۃ والرضوان کے خلیفہ اطاعت میں شامل ہونے کے لیے حاضر  
ہو گیا ہوں مجھے اپنے قدموں میں جگہ عطا فرما کر میرے خالی دامن کو علوم و آگہی  
یا خصوص فقہ حنفی کے خزانے سے بھر دیں۔

اس لڑکے کی سرگذشت سے شیخ جعفر کافی متاثر ہوئے۔ پر شفقت

لہجے میں فرمایا: بیٹے میرے پاس علم کا جو بھی تھوڑا بہت سرمایہ ہے اسے سپرد  
کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ یہ تو تمہاری اپنی صلاحیتوں، مقصد سے  
والہانہ لگاؤ اور سچی تڑپ پر منحصر ہے کہ تم مجھ سے کتنا کچھ حاصل کر سکتے ہو۔  
ویسے مجھے کچھ اندازہ ہو چکا ہے کہ میں تمہاری منزل کی ابتدا تو ہوں مگر  
انتہا نہیں۔ جاؤ تم خوب محنت کرو۔ مولے عز و حیل تمہیں اپنے نیک مقصد  
میں کامیاب و بامراد فرمائے، گردش سیل و نہار اور زمانے کے اٹا پھیر

میں اس لڑکے کا علمی سفر جاری رہا۔ بتدریج ذہنی ارتقاء کی ان بلندیوں تک پہنچ گیا جن تک اُس کے ہم عصر صرف رشک بھری نگاہوں سے دیکھ سکتے تھے اور بس! فطری ذہانت، وہی فیضانِ اولیٰ شیخ جعفر کی خصوصیت توجہ کی بدولت وہ آپ کی درسگاہ کا ایسا ہیرا ثابت ہوا جسکی شعاؤں کے بعد کے دروہام جگمگانے لگے۔

”تفقه فی الدین“ میں کمالات کی منزل جوں جوں قریب آنے لگی اس کی تشنگی بڑھتی گئی اس کے دل و دماغ میں علم و یقین کا اجالا جیسے جیسے پھیلنا گیا ہلّ منّ مزید کی تڑپ بڑھتی گئی ہے

مکتبِ عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

بالآخر وارفتگی شوق نے اتنا مجبور کیا کہ ایک دن انتہائی شفیق و مہربان استاد کی اجازت سے مصر چھوڑ دیا ہے

میں کہاں رکنا ہوں عرش و فرش کی آواز سے

جھکو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

صحرا کی وحشتوں، راستے کی جان لیوا کلفتوں، اور سفر کی صعوبتوں کو

روندتے ہوئے ایک صبح اس نے ”شام“ کی سرزمین پر قدم رکھا۔

مصر ہی میں اُس نے وقت کے بے مثل فقیہ اور ملکِ شام کے قاضی

القضاة (چیف جسٹس) حضرت ابو حازم کی اعلیٰ درجہ فقاہت کا چرچہ

سن رکھا تھا۔ آرزوئے شوق نے کشاں کشاں اُن کی چوکھٹ تک پہنچا دیا

قاضی القضاة سے تفصیلی ملاقات کے بعد اُسے یقین ہو چلا کہ اب تفقه فی الدین

کے سلسلے میں ہی میسری آخری منزل ہوگی چننا پختہ ہی ہوا۔ اس کی



ذہانت، ذکاوت، فقہ حنفی سے والہانہ لگاؤ اور بے پناہ وابستگی دیکھ کر شیخ ابو حازم کو اس پر پیارا آ گیا۔ اور ایسی خصوصی توجہ فرمائی کہ وہ اپنے وقت کے فقیہوں کا سرتاج بن گیا۔

میدانِ فقہ میں اپنی انفرادیت کا سکہ بٹھا دینے کے بعد فقہ ہی کی طرح حدیث کو بھی اپنا خصوصی میدان منتخب کیا۔ اور اس نازک اور دشوار ترین سفر میں جتنے بھی ائمہ رفتن، مشایخ وقت اور محدثین زمانہ ملے ان سب کے استفادہ اور اکتسابِ فیض کیا بن کی طویل صحبتوں کے فیضان نے اسے فقیہ و مجتہد کے ساتھ ہی ساتھ نہ صرف ایک عظیم محدث بلکہ حافظُ الحدیث بنا دیا۔

حضرت سلیمان بن شعب کیسانی، ابو موسیٰ صلیقی، ہارون بن سعد یونس بن عبد اعلیٰ، ہارون بن سعید ایلی، ابراہیم بن ابو داؤد، بکار بن قتیبہ، عبد الغنی بن رفاعہ، محمد بن سعید ایلی وغیر ہم جیسے ائمہ رفتن اور محدثین زمانہ کا شمار اس کے اساتذہ کی فہرست میں ہوتا ہے۔

اب محمد بن سلامہ کے بیٹے احمد کی شہرت اور اس کے علمی فضل و کمال کا آوازہ دور دور تک پہنچ چکا ہے۔ عالمِ اسلام میں اس کی علمی جلالت و مرتبت کا شہرہ تیزی کے ساتھ پھیلا جا رہا ہے۔ ہر طرف سے طالبانِ شوق کا قافلہ چلا آ رہا ہے۔ اس کی مسندِ علم و فضل طالبانِ علوم دینی کے لیے مرکزِ ہجوم آ رہی ہے۔ بتدریج وہ عالمِ اسلام کا مرکزِ عقیدت بنتا گیا۔ بڑے بڑے کجکلاہوں کی گردنیں اس کے علمی وقار و دبذبے کے آگے جھک گئیں۔ آج فقہاء و محدثین کی طویل فہرست میں اس کے تلامذہ کے نام جنتِ نگاہ بنے ہوئے ہیں۔

عالم اسلام نے بڑے احترام اور عقیدت و محبت کے ساتھ محمد بن سلا  
 کے بیٹے احمد کو حضرت امام طحاوی کے لقب سے یاد کیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
 ہزاروں سال زنگیں اپنی بے نوری پہ رُوئی ہے  
 بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دید و رسید

امام ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ تیسری صدی ہجری کے ایک عظیم محدث اور پیش  
 فقیہ تھے۔ فقہاء و محدثین کے طبقات میں ان کا شمار یکساں ہوتا ہے۔  
 سلف صالحین اور علماء متقدمین میں ایسی شخصیتیں نایاب کی حد تک کیا  
 ہیں کہ جن کا شمار فقہاء و محدثین میں یکساں ہوتا ہو۔ گویا آپ کی کوہِ پیکر  
 شخصیت اساتین امت میں مجمع البحرین کی حیثیت رکھتی ہے  
 کیا سن ہے جمال ہے، کیا رنگ و روپ ہے  
 وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تہا دکھائی دے

محدثین آپ کو حافظ اور امام کہتے ہیں زیادہ ہے کہ محدثین کی اصطلاح  
 میں حافظ اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کو ایک لاکھ حدیثیں سنیں  
 سند اور اس کے راویوں کے احوال جرجا و تعدیل یاد ہوں، اور  
 فقہائے عظام نے آپ کو مذہبِ حنفی کا ایک عظیم مجتہد مانا ہے۔

علم و فضل ہی کی طرح آپ صاحبِ زہد و تقویٰ بھی تھے۔ عوام  
 سے لے کر خواص تک احترام و عقیدت سے آپ کے حضور خمیدہ سر تھے  
 آپ بڑے بیباک نڈر اور حق گو تھے۔ نتاج کی پروا کئے بغیر کلمہ حق کا  
 اظہار برملا فرماتے اور بڑی سختی کے ساتھ اس پر قائم بھی رہتے تھے

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی  
 اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُو باہی

حضرت امام ابو جعفر طحاوی کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ ہر دور میں مورخین اور سیرت نگاروں نے آپ کے حضور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، کلام، تاریخ رجال وغیرہ پر آپ نے کثیر اور معرکہ الآثار التصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ یوں تو آپ کی تمام کتابیں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں مگر ان تمام عظیم الشان علمی شاہکاروں میں، «شرح معارف الآثار»، کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مسلک حنفی تو الگ رہا۔ کسی بھی مسلک میں اس کتاب کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی ہے جس حسن و خوبی اور ذہانت کے ساتھ حدیث، فقہ، رجال کے متفرد علوم کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ وہ صرف «امام ابو جعفر طحاوی» ہی کا حصہ ہے۔

ایں سعادت بزرگ بازو نیست

تانه بخش خداے بخشنده

امام طحاوی کو اس کتاب لکھنے کا مقصد صرف احادیث جمع کرنا نہیں بلکہ ان کو یہ ثابت کرنا تھا کہ مسائل شرعیہ میں رشک عرب، فخر عجم، امام الامۃ، سراج الامۃ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عظیم موقف احادیث کے خلاف نہیں (جیسا کہ تنگ دل جاسدین بے ضمیر منکرین خصوصاً ماہنی و حال کے وہابیہ غیر مقلدین کا پرہیزگارہ ہے) اور اگر بظاہر کوئی حدیث امام اعظم کے مسلک کے خلاف نظر آتی ہے۔ تو وہ مؤول ہے یا منسوخ جس سے قطعاً بے خبر ہیں حدیث دان کے یہ دعویٰ دار بالشتے بیوقوف

اس عظیم کتاب میں حضرت امام طحاوی کا علمی شکوہ پورا جاہ و جلال

کے ساتھ نظر آتا ہے۔ کہیں احادیث پر فنی گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔  
 تو کہیں مخالفین کے پیش کردہ روایات پر جرح کرتے ہوئے اَسْمَاءُ الرَّجَالِ  
 کا دستِ گراں بار لئے دکھائی دے رہے ہیں اور کہیں کہیں پر تو ان کے  
 موقف کا عقلی طور پر پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے دلائل و براہین سے ان کے  
 موقف کے تار و پود بکھیر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب  
 روایت و درایت کا شاہکارِ اعظم ہے۔

حضرت حافظ امام ابو جعفر طحاوی  $۲۳۹$ ھ میں پیدا ہوئے اور  
 بیاسی سال کی قابل رشک زندگی گزار کر  $۳۲۱$ ھ میں واصلِ بحق ہوئے  
 ساہبادر کعبہ وبت خانہ می نالذھیات  
 تازیرم عشق اک دانتائے راز آید برس

# انداز مسیحائی

زُلف بنگال، چشم بنگال، سحر بنگال کے تماشے حشر آفرینیوں کے باوجود سلطان غیاث الدین بلبن کا فیاض بہسا در اولو العزم بیٹا بغرا خاں اپنی زندگی کی مشکل ترین مہم سے سرخرو ہو کر جشن فتح بنگال منا رہا تھا۔ ہر طرف سے تحسین و مرجبا، مبارک و سلامت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ دربار کی شعزاد اس عظیم الشان فتح پر ایک سے بڑھ کر ایک فتح نامے اور قصیدے پیش کر رہے تھے۔ فراخ دل عالی حوصلہ اور فیاض شاہزادہ بھی فیض عطا کا پیکر مجسم بنا ہوا تھا۔ اور جب بطوطی ہندو خاقانی زماں، بلیل خوشنوا خسرو نے منفرد لب لہجہ میں اپنا قصیدہ پیش کیا تو رنگ و آہنگ کا موسم بدل گیا اور پڑھنے والوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا قصیدہ لپیٹ کر حیب میں ڈال لیا۔

پھر اس کے بعد چراغوں کی روشنی نہ رہی

تو پھر شاہزادے نے بھی جو دو سخا کی تاریخ میں ایک جلی عنوان کا اضافہ کرتے ہوئے حضرت امیر خسرو کو پانچ لاکھ تنکے عطا کئے۔

امیر خسرو اس گرانقدر انعام کو چھروں پہ بار کر کے شاہی لشکر کے ہمراہ دلی واپس ہوئے۔

شاہی لشکر دلی کی طرف رواں دواں تھا۔ منزل مقصود کا قاصد

قریب قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے والدین، بیوی بچوں سے جلد تر ملاقات کے شوق میں فوج زمین کی طنائیں سمیٹ رہی تھی۔

رات اپنا سیاہ بازو پھیلائے کابرات کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے دو سکر پیر میں داخل ہونے والی تھی کہ اچانک ایک سرائے سے گنٹے ہوئے امیر خسرو نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔ آپ کے رکتے ہی سمجھے رواں دواں لشکر رک گیا۔ منزل کی طرف تیزی سے بڑھتے کارواں کے اچانک رگ جانے سے فوج میں فطری اضطراب ہوا۔ آپ کے سمجھے جانے والے ایک فوجی نے ادب کے ساتھ دریافت کیا: «حضور! آپ نے سواری کو کیوں روک لیا؟»

«آہ! تمہیں کچھ محسوس نہیں ہو رہا ہے؟»

«کچھ بھی تو نہیں»

«یوئے شیخ می آید» (پیر کی خوشبو آرہی ہے)

«یوئے شیخ؟»

«ہاں ہاں یوئے شیخ، مرشد کابل کی خوشبو!»

«حضور والا دلی تو ابھی بہت دُور ہے»

جانے کتنی میل دُور! اتنی دُور سے یوئے شیخ کا کیا مطلب ہے؟»

«ارے بھائی یوئے شیخ کا مطلب یوئے شیخ ہی ہوتا ہے» یہ کہہ کر

اضطرابی کیفیت میں گھوڑے سے اتر پڑے۔ وارفتگی شوق میں سرائے

کی طرف لپکے جہاں سے یوئے شیخ آرہی تھی۔

ایک فوجی نے آگے بڑھ کر مطمئن کرنا چاہا۔

«حضور والا! اس سرائے سے یوئے شیخ کا کیا واسطہ ہے؟»

آپ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

«مجھے کیا معلوم یوئے شیخ کیا ہوتی ہے؟»

تو نے تو کر دیا طیب آتش سینہ کا علاج  
 آج کی درد آہ میں بوئے کباب آئی کیوں  
 میرے بھائی اگر بوئے شیخ اس طرف سے نہیں آئی تو خسرو کی مشاہم جا  
 معطوبے خود کیوں ہوئی۔ ہونہ ہو اس سرائے میں کوئی خاص بات ضرور ہے  
 جسے ارد گرد کے ماحول کو عطرینز کر رکھا ہے۔  
 کوچے کوچے میں ہسکتی ہے یہاں بوئے قمیص  
 یوسفستاں ہے ہر گوشہ کنعان عسرب  
 رات بھینگ چکی تھی۔ سیاہ شب کی زلفیں بچھ چکی تھیں۔ مسافریندگی  
 میٹھی آغوش میں پہونچ چکے تھے البتہ سرائے کا مالک جاگ رہا تھا۔  
 فوجیوں کی مسلسل دستک پر اس نے دروازہ کھولا۔ جوں ہی نظر  
 پڑی تو اس باختہ ہو گیا، ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا کیکیا  
 آواز میں گویا ہوا "سرکارہم سے کوئی غلطی ہوئی؟ کوئی جرم سرزد ہوا،  
 جانے انجانے میں کوئی بھول ہوئی؟"  
 اہے نہیں بھائی! تم سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ گھبرانے کی  
 کوئی بات نہیں۔ ہم چند مسافروں کو دیکھتا چاہتے ہیں بس!  
 جوں ہی پھاٹک کھلا، امیر خسرو بے تابانہ اندر داخل ہوئے سامنے  
 ہی ایک خستہ حال مسافر پر نظر پڑی جو زمین پر بے خبر سو رہا تھا۔ اسکی  
 طرف سے بوئے شیخ آ رہی تھی جس نے خسرو کے سوزدروں کو دوچند کر دیا۔  
 تھامے دل میں جو چوٹ تھی دہنی ہائے غضب بھر گئی  
 پوچھو تو آہ سرد سے ٹھنڈی ہوا چلائی کیوں  
 اپنے بڑی آہستگی سے اُسے جگایا۔ آنکھیں کھولنے پر اپنے چاروں

طرف فوجیوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ تو اس باختگی کے عالم میں قبل اس کے کہ وہ بھی سرائے کے مالک کی طرح اپنی صفائی پیش کرتا۔ حضرت امیر نے اسے انتہائی نرم، شیریں، لطیف اور کریمانہ لہجے میں مخاطب فرمایا۔

» بھائی ہم تمھاری نیند میں خلل انداز ہوئے، معذرت چاہتے ہیں۔ دل نیاز پیشہ کے اضطراب مسلسل نے مجبور کر دیا۔ اچھایہ بتاؤ تم کہاں سے آرہے ہو؟«

» حضور والا ہم دہلی سے آرہے ہیں!«

» اچھایہ بتاؤ کہ تم دہلی میں بادشاہ دین و دنیا، سلطان المشائخ محبوب الہی سرکار نظام الدین اولیاء کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہو کتھے تھیں ان کی زیارت نصیب ہوتی تھی؟«

» جی ہاں! خاص کر ہم انھیں کی خدمت عالی میں ایک بڑے مقصد لے کر بڑی امیدوں کیساتھ حاضر ہوئے تھے۔ ان کی چارہ سازی درد مندی، بندہ نوازی، کرم فرمائی، دستگیری اور اندازِ مسیحائی کا بڑا شہرہ سنکر مگر اپنی زنگ آلود، مقفل قسمت کی کنجی ویاں بھی نہیں ملی۔

ہمارے وقت کی بے مہری، جس کی فیض و عطا، داد و بخش کا شہرہ برصغیر بھر میں پھیلا ہوا ہے، وہاں سے بھی خالی ہاتھ واپس ہو رہا ہوں۔

امید بھی اب ٹوٹی رستہ ہے نہ منزل ہے

» ایسا تو نہیں سکتا کہ ان کی بارگاہِ فیض و عطا سے کوئی ہاتھ خالی جائے۔ بالخصوص تم جیسا خستہ حال، غریب الدیار آدمی، اپنی



پریشانی، خستہ حالی اور ضرورت کیسا کہ صورت واقعہ کی پوری تفصیل  
بیان کرو۔

” حضور والا! میں ایک پریشاں حال اور بے حد غریب آدمی ہوں  
حالات کی کڑی دھوپ نے مجھے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا۔ غریب اور بھی  
دنیا میں ہوں گے مگر معاشی بد حالی نے مستقل مجھ سے دوستی کر لی ہے  
زندگی کی گاڑی جیسے تیسے کھینچ کھانچ کر عمر کی اس منزل تک لے آیا۔ میری  
حرماں نصیبی یہی نہیں کہ غربت نے مستقل میرے گھر پر ڈیرا ڈال رکھا ہے  
مزید برآں اس جان ناتواں پر جوانی کی پرخطر دہلیز تک تلے اوپر پہنچنے  
والی سات جوانیوں کا بوجھ بھی ہے۔ ہم نے اب تک بڑے غم برداشت  
کئے۔ صدقات بھیلے، مدد کے بوجھ اٹھانے جو میری کر بناک ماضی کا  
ایک حصہ ہیں۔ مگر سات جوانیوں کے بوجھ سے ابھی سے لرزہ بر اندام ہوں۔  
میرا سکون غارت ہو چکا ہے۔ میری تمنا تھی کہ میں اپنی بچیوں کی شادی سے  
سبکدوش ہو جاؤں مگر مجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ میں اپنی ایک ہی لڑکی کو  
اس کی زندگی کی سب سے بڑی مسرت سے ہمکنار کر سکوں۔  
غموں کی دھوپ میں کاٹا بنے زندگی کا سفر  
کہ راستے میں کوئی نخل سایہ دار نہ تھا

انھیں ناتمام حسرتوں کو لیکر میں سلطان الاولیاء سرکار محبوب الہی کی  
بارگاہ بندہ نواز میں حاضر ہوا۔ اپنی داستان الم گوش گزار کی جسے سنکر  
آپ کی پلکیں نم آلود ہو گئیں، بستلی کے کلمات خیر سے مجھے تسکین فرمائی اور  
ارشاد فرمایا کچھ دن میرے پاس رہ جاؤ، خدائے ذوالجلال بہتری کی کوئی صورت  
پیدا کرے گا۔

چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق میں آپ کے قدموں میں رہنے لگا۔ اس امید  
 قوی پر کہ یہاں تو ہر طرف سے فتوحات کا سیلاب آتا ہے جس سے خلق خدا سیرا  
 ہوتی ہے۔ میری بھی بگڑی کسی دن بن جائے گی۔ مگر بائے رہے برگشتگی  
 تقدیر! جس دن سے میرے منحوس قدم وہاں پڑے کہیں سے کوئی چیز آپ کی  
 بارگاہ میں آتی ہی نہیں کہ جس سے میرے درد کا درماں ہوتا۔

کچھ دن انتظار کے بعد بالآخر میں نے رخصت کی اجازت چاہی تو آپ  
 تڑپ اٹھے۔ ندامت بھرے انداز میں فرمانے لگے » اس فقیہ بڑی امیدیں  
 وابستہ کرنے والے بہان! میں تم سے شرمندہ ہوں کہ فی الحال میں تمہاری  
 کوئی خدمت نہ کر سکا اور حق میزبانی ادا نہ ہو سکا۔ بروقت تمہیں دینے کے  
 لیے کچھ نہیں ہے۔ البتہ ایک جوڑی پُرانی جوتی ہے جو میری اپنی ملکیت ہے۔  
 اگر تم اسے قبول کر لو تو مجھے بڑی مسرت ہوگی کہ تم میرے یہاں سے بالکل  
 خالی ہاتھ نہیں گئے۔«

اسے میں نے اپنا نصیب سمجھ کر لے لیا اور وہاں سے چل پڑا۔  
 امیر و غریب، رئیس و فقیر، شاہ و گدا کو نوازنے والی بارگاہ سے  
 اپنی محرومی پر میں سخت ادا اس و غمزدہ ہوں۔ اپنی رڑکیوں کی شادی کا مسئلہ  
 لیکر میں بادشاہ دین و دنیا کے پاس حاضر ہوا تھا۔ اُن کی بارگاہ فیض و عطا  
 سے ایک پُرانی جوتی ملی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اب میرے مسئلے کا حل  
 کیا ہوگا۔ میرے نصیب کی در بدری کب ختم ہوگی؟  
 ہمائے گھر کی دیواروں پہ ناہنجر  
 اُداسی بال کھولے سو رہی ہے  
 امیر خسرو نے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا » دوستو! کیا میں

نہیں کہتا تھا کہ اس سرائے میں ضرور کوئی خاص بات ہے جسے خسرو کے پاؤں  
میں زنجیر ڈال دی ہے ۛ

”ابنہی مسافر! کیا تم اس مقدس نعلین کو جو سلطان المشائخ محبوب اللہی  
سید نظام الدین عثمان نے تمہیں اپنے کرم سے عطا فرمائی ہے، میرا تھو  
فروخت کرنا پسند کرو گے؟“

سوال سے زیادہ لہجہ عجیب تھا۔ وہ چکر ا کے زہ گیا۔ ایک ایسا شخص  
جو فوجی عہدیداروں میں نمایاں ممتاز اور منفرد و معزز نظر آ رہا تھا۔ فوجی جس کے  
سامنے بؤدب اور وہ خود ان کی نگاہوں میں محترم تھا! اس کے وہم و گمان  
میں بھی نہیں تھا کہ اس پرانی جوتی کو جو چلتے وقت سلطان المشائخ نے  
اسے عطا فرمائی تھی جس کے بارے میں ابھی تک وہ خود سنجیدہ نہیں ہو سکا  
تھا اس کو خریدنے کے لیے کوئی سوچے گا بھی! جبکہ یہاں ایک بڑا محترم  
انسان اس کے خرید و فروخت کی بات بھی کر رہا ہے۔ ابھی وہ سوچ کے دائرے  
سے باہر نہیں نکل سکا تھا کہ امیر خسرو کی دوبارہ آواز ابھری،  
خوش نصیب انسان! تم نے بتایا نہیں کہ اس قابل احترام جوتی کا  
تم کیا لو گے؟“

دوبارہ مخاطب کرنے پر وہ چونکا۔ آپ مذاق تو نہیں فرما رہے ہیں؟  
بھلا آپ جیسا معزز آدمی پرانی جوتی کو لیکر کیا کرے گا؟ کسی بادشاہ یا شہزادے  
کی بھی نہیں کہ اس کے نقش و نگار میں کچھ سونے چاندی کی زری نکل آئے  
ایک دنیا بیزار درویش کی جوتی اتنی اہمیت تو نہیں رکھتی کہ آپ جیسا معزز  
انسان اس کو خریدنے کی بات کرے۔ اگر کسی طرح کا یہ انداز ستم ہے تو  
دکھوں کے ڈھیر میں ایک ہلکا اضافہ یہ بھی سہی کہ سے

تن بھمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہسم

استغفر اللہ بمعاذ اللہ! تمہیں کسی طرح کی تکلیف پہنچانا یا مذاق اڑانا میں  
گناہ سمجھتا ہوں۔ آخر تم یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں اپنی پیشکش میں مخلص  
ہوں۔ ویسے کوئی زور زبردستی نہیں، صرف گزارش ہے کہ وہ مقدس نعلین کو  
قیمتاً دیدو۔ جو بھی مناسب قیمت تم کہو گے میں دینے کو تیار ہوں آپ کے  
متین و سنجیدہ لب و لہجے سے اسے یقین ہو چلا کہ مجھ سے مذاق نہیں کیا جا رہا  
ہے۔ بڑی مشکل سے اٹکتے جھکتے، صرف اتنا کہہ سکا "اس محترم انسان کی نعلین  
کی قدر و قیمت کا مجھے اندازہ نہیں۔ آپ جو بھی عطا فرمائیں گے ہم اُسے  
شکریہ کے ساتھ قبول کر لیں گے۔"

سردست میرے پاس صرف پانچ لاکھ تنکے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں  
کہ تمہاری ہی طرح میں بھی حالت سفر میں ہوں۔ اس حقیر اور معمولی رقم کے  
عرض اگر مجھے تم وہ قیمتی اور مقدس نعلین دے دو تو ہم تمہارے شکر گزار  
ہوں گے۔ آپ جذبہ شوق میں بولے جا رہے تھے اور اس پاس کے لوگ  
عالم حیرت میں دم بخود۔ خود مسافر پر توجیر توں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

امیر خسرو نے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ اس سلسلے میں جو کچھ  
میں کہہ رہا ہوں اس میں کذب یا مذاق کا شائبہ تک نہیں ہے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

حیرت کا طلسم ٹوٹنے پر مسافر نے عرض کیا "حضور والا! اگر آپ  
اپنی اس پیشکش میں مخلص ہیں جبکہ آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں تمہاری  
ہی طرح مسافر ہوں تو اتنی بڑی رقم آپ حالت سفر میں کہاں لائیں گے؟"

” سب کچھ میرے پاس یہیں ہے۔ پانچ لاکھ تنکے چخروں پر لدے ہیں جو سرائے کے باہر کھڑے ہیں۔ یہ مقدس ہوتی ہیں دے دو۔ اس کے بدلے میں یہ دولت گھر لے جاؤ۔ بچیوں کی شادی کشادہ دستی سے کرواؤ اپنی زندگی بھر کی محرومیوں کا ازالہ کرو۔“

سافر تیزی کے ساتھ سرائے سے باہر نکلا اور بڑی بے یقینی کے عالم میں چخروں پر لدی دولت کو دیکھنے لگا۔ جاگتی آنکھوں سے وہ خواہ نہیں بلکہ زندگی کی ایک خوبصورت حقیقت دیکھ رہا تھا۔

”اب تو تمہیں یقین آگیا۔ جلدی بولو کیا کہتے ہو؟“

”حضور عالی! اب مجھے یقین آگیا۔ مگر میں یہ دولت کیسے

لے جا سکتا ہوں؟ راستے میں چور، لیٹھے، ڈاکو ملیں گے، تنہا ایک میری جان، مال الگ لوٹ لیں گے، جان الگ جائیگی۔ میں پھر اسی طرح کنگال کا کنگال لادہ جاؤں گا۔“

”فوج کی حفاظت میں دولت تمہارے گھر پہنچادی جائے گی۔

بس اب تو مطمئن ہو۔ اب لاؤ جلدی کرو۔“

اس مفلوک الحال، غریب الدیار، اجنبی مسافر نے بھیگی پلکوں کے

ساتھ مقدس نعلین کو چومتے ہوئے امیر خسرو کو پیش کیا۔ پھر گلوگیر آواز میں

کہنے لگا ”دلی پہنچ کر بادشاہ دین و دنیا، شہنشاہ فیض و عطا سے

دست بستہ سلام کہیں، واپسی پر راستے میں بدگمان بھی کبھی ہو جا یا

کرتا تھا کہ میر سنگین مسائل کا حل کیا ہی پرانی جوتی ہے؟ غلام بہت

شرمندہ ہے۔ میری طرف سے معافی بھی مانگ لیں۔ ہم جیسے کم نگاہ اور

ظاہر میں اس انداز میں سچائی کو کیا سمجھیں۔ جو دوستی، فیض

و عطا کے بادشاہ کا انداز بخشش و عطا ہم گد اگروں کے فہم و ادراک سے  
بہت ماورا ہے سے

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا  
نگاہِ مرد موہن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں  
آپنے اس اجنبی مسافر سے پیرو مشد کے مقدس نعلین لیکر بڑے  
احترام و عقیدت کیساتھ چوما، آنکھوں سے لگایا، سر سے دستار کھول کر نعلین  
شریف کو اس میں لپیٹ کر سر سے باندھ لیا۔

جذبہ شوق کا اضطراب لئے کارواں کیساتھ منزل بہ منزل دلی کی  
طرف بڑھنے لگے۔ راستہ ہے کہ کٹنا ہی نہیں۔ زمین کی طنابیں جیسے سمٹنے  
کے بجائے پھیلتی جا رہی ہیں۔ کبھی خوشی کے لمحات ابھی جا نگسل ہوتے  
ہیں۔ بالآخر جذبہ شوق کی گھاگھی میں دلی پہنچ گئے۔ سب سے پہلے پیرو مشد  
نظام الحق و الشرع والدین کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہوئے۔ قدمبوسی کی اور  
دست بستہ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ آپ کے ارد گرد حاجتمندوں، مرادیوں  
اپنی بیگانوں سب کا جمع لگا ہوا تھا۔ سلطان المشائخ کی آواز ابھری:

”خسرو! اقبال مند، عالی حوصلہ شہزادے کے ساتھ گئے تھے، فتح  
کی جلو میں واپس آئے تو میرے لئے بھی کچھ لئے کہ بس خالی ہاتھ چلے  
آئے؟“

اگرچہ صورت واقعہ پورے طور پر آپ پر روشن تھی۔ لوگوں کے دلوں  
کے خطرات سے آگاہ رہنے والے سلطان المشائخ نے تجاہل عارفانہ سے  
پوچھا کہ خسرو کی بے پناہ محبت کا تماشہ لوگ کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں  
اور لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ اس ترک سے میری شدید وابستگی یوں ہی

نہیں ہے سے

میں اس غار فانیہ تجاھل کے صدقے

ہر اک دل کو چھیدا مرادوں سمجھ کے

نم آلود پلکوں سے عرض کرنے لگے۔ ایک غلام کی حقیقت ہی کیا جو سلطانِ فیض  
و عطا کو کچھ پیش کر سکے۔ ہاں حضور والا کے قدموں کی ایک نشانی اپنے  
سر کا تاج زرین بنا کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہو گیا ہوں۔ یہ میری حیات  
کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر اسے شرفِ قبولیت عطا ہو جائے تو میرے لئے  
سب سے بڑی سعادت ہوگی۔ یہ کہہ کر دستار سر سے کھولی اور اس سر سے ہی  
جوتی نکال کر خدمتِ اقدس میں پیش کر دی۔

اے! یہ تو میں نے ایک مفلوک الحال مسافر کو دیدی تھی۔ تمہیں کیسے ملی؟

جی ہاں قبلہ عالم! یہ وہی مقدس نعلین بنے جسے ہم نے اس فوسے قیمتاً خریدی تھی

”خسرو! تم نے اس غریب آدمی سے کتنے میں خریدی؟ میں بھی تو

کچھ سونوں۔ (تب تبم زریب چل رہا تھا)“

”حضور والا! پانچ لاکھ تنکے میں!“

”صنبر پانچ لاکھ؟“

”جی سرکار والا تبار!“

”خسرو! بسیار ارزاں خریدہ (خسرو! تم نے بڑے سستے داموں خریدنا)

”سکار عالی! خسرو غریب بھی اس غریب کی طرح غریب الوطن تھا۔

مسافت میں میرے پاس یہی سب کچھ تھا۔ اگر میں دلی میں ہوتا تو اس کی بڑی

سے بڑی قیمت دے سکنا تھا، ایسے خسرو کی گردن جھکی ہوتی تھی۔ پیر و مرشد

کے قدموں سے لگ کر عزت پانچانے والی جوتی کو اتنے کم داموں پر خرید کر

شرمندہ تھے سے

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا

اس کے احوال سے واقف نہیں پیرانِ طریق

خانقاہ میں سناٹا طاری تھا۔ لوگ دم بخود تھے۔ یہ محبت کیسی تھی؟ یہ

کیسا عشق تھا؟ تڑپ کی یہ کون سی منزل تھی؟ چاہت کا یہ کیسا انداز تھا؟

جذبِ دروں کی یہ کون سی کیفیت تھی؟ سے

یہ راز و نیازِ محبت ہیں ناصح

نہ وہ بے خبر ہیں نہ ہم بے خبر ہیں

یہی جذبہٴ سوزِ دروں تھا کہ سلطانِ المشائخ فرماتے تھے ”میں سب سے

تنگ آجاتا ہوں یہاں تک کہ اپنے سے بھی۔ مگر اس ترک (یعنی خسرو)

سے نہیں۔ اگر شرع اجازت دیتی تو بسم اور خسرو ایک ہی قبر میں آرام

کرتے“ سے

مکتبِ عشق کا دستور نہ لادیکھا

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

خسرو سے حضرت محبوبِ الہی کی محبت کا اندازہ اس سے لگائے۔ فرماتے

ہیں ”کل میدانِ قیامت خدائے ذوالجلال نے مجھ سے پوچھا کہ نظام الدین

دنیا سے سیر لیے کیا لائے؟“ تو میں عرض کر دوں گا ”مولیٰ! میں سیر کیے

اس ترک کے سینے کا سوز لایا ہوں“

فرماتے ہیں ”میں جنت میں اس ترک کے بغیر قدم نہیں رکھوں گا“

بلبل شیراز حضرت شیخ سعدی آپسے ملنے ہندوستان آئے۔ حضرت

خسرو سے امیر خسرو کی ملاقات ہوئی۔ کلام میں شیرینی، لطافت، مقبولیت عام



کے لیے لعاب دہن کی درخواست کی۔ حضرت خضر نے جواب دیا۔  
”یہ سعادت حضرت سعدی حاصل کر چکے جو ان کا مقدر تھا۔ اب دوسرے  
کے لئے نہیں!۔ یہ سنکر آپ کو بڑا تکدر ہوا۔ چہرے پر تکدر کی کیفیت  
لئے قبلاً عالم کی بارگاہ میں حاضر ہی دی۔

”ترک کیا بات ہے؟ چہرہ کیوں اتر اہوا ہے؟“

”پیر و مرشد روشن ضمیر ہیں۔

”تم بھی تو کچھ کہو“

”آج حضرت خضر سے ملاقات ہوئی تھی۔ کلام میں شیرینی کے لئے  
لعاب دہن کی درخواست کی تو یہ کہہ کر مسترد فرمادی گئی کہ یہ شیخ سعدی کا نصیب  
تھا جو وہ حاصل کر چکے۔ اب دوسرے کے لئے ممکن نہیں۔

”بس اتنی سی بات پر منہ اتر گیا اچھا اپنا منہ کھولو“

خسرو نے اپنا منہ کھولا۔ آپ نے ان کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا۔

اس کی بدولت کلام میں وہی حلاوت، وہی لطافت، اور آپ کے کلام  
بلاغت نظام کو جو قبولیت عام کی سند ملی وہ صبح قیامت تک کے لیے ایک  
ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔

## بیعت میں انفرادیت

والد محترم ابتدائی عمر ہی میں  
لے کر سلطان الاولیاء، سرکار  
محبوب الہی کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تاکہ دامن کرم سے وابستگی کا اعزاز  
مل جائے۔ جب خانقاہ کے دروازے پر پہنچے تو والد گرامی سے کہنے  
لگے، آپ اندر جائیے۔ میں یہیں باہر بیٹھتا ہوں بغیر بلائے نہیں جاؤں گا۔  
دراصل بچپن ہی میں بیعت میں انفرادیت چاہتے تھے۔

والد ماجد اندر جا کر خاموشی کیساتھ بیٹھ گئے۔ امیر خسرو نے باہر بیٹھے بیٹھے ایک  
رباعی نظم کی جسے زیر لب آہستگی سے گنگنانے لگے۔

تو آں شاہی کہ بر ایوانِ قصر ت

کبوتر گرشید باز گرد

غریبے مستندے بر در آمد

بیاید اندروں یا باز گرد

تو ایسا بادشاہ ہے کہ تیرے قصر کے کنگورے پر اگر کبوتر بیٹھ جائے تو وہ بھی  
باز بن جائے۔ ایک غریب جاچمند تیری چوکھٹ پہ حاضر ہوا وہ اندر آئے یا  
یاہر ہی سے واپس چلا جائے۔ یہ سوچ کر کہ اگر شیخ کامل ہیں تو ان کی نگاہ  
دلوں کے خطرات پر بھی ہوگی۔ پھر اگر انھوں نے مجھے اپنی غلامی میں لینے کے  
قابل سمجھا تو ضرور اندر بلائیں گے اور اگر انھوں نے نہیں بلایا تو ایسے ہی بغیر  
ملے واپس چلا جاؤں گا کہ وہ مرشد کامل ہی کیا جو دلوں کی دھڑکنوں سے  
باخبر نہ ہو سکے۔ ابھی اس غور و فکر میں تھے کہ سلطان الاولیاء نے اپنے خادم  
خاص سے سکر اتے ہوئے فرمایا: دروازے کے باہر ایک لڑکا بیٹھا ہوگا  
اس کے سامنے یہ رباعی پڑھ کر خاموشی کے ساتھ واپس چلے آؤ۔

بیاید اندروں مردِ حقیقت

کہ با مایک نفس ہمراز گرد

اگر ابلہ بود آں مردِ نادان

ازاں را ہے کہ آسہ باز گرد

چاہئے کہ اندر آئے وہ مردِ نادان کہ میرے ہمراہ بیٹھ کر میرا ہمراز ہو جائے اور

اگر وہ مردِ احمق و نادان ہے تو اسے چاہئے کہ جس راستے سے آیا ہے اسی  
راستے سے واپس چلا جائے۔

اتنا سنا تھا کہ انتہائی بیتابلی کیساتھ اندر داخل ہوئے۔ پیر و مرشد  
کے قدموں پر سہاڑا کھا اور چہان بے تاب کو ہمیشہ کے لیے ان کے حوالے کر دیا  
تقریبِ محبت کی کیا خوب وہ ساعت تھی  
جس وقت ہوا مجھ سے وہ ماہِ حبیب واقف

یوں تو سلطان الاولیا، خیر الازکیا، امام الاصفیاء حضرت سیدنا و مولانا محمد  
نظام الحق و الشرع والدین کے دامنِ کرم سے وابستہ ہو کر آفتاب و ماہِ تابان  
بن کر چمکنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ حضرت برہان الدین غریب،  
حضرت قطب الدین منور، علامہ فخر الدین زرادنی، مولانا علاء الدین سیسی،  
مولانا شمس الدین چینی، سید نصیر الدین چراغ دہلوی، اخی سراج بنگالی،  
مولانا حسام الدین طلسانی وغیرہم۔ یہ وہ لوگ ہیں جو علم و فضل، زہد و وسوسہ  
تقویٰ و طہارت، جذب و سلوک، اعتماد و یقین، توکل و استغناء میں ہمیش  
و بے مثال تھے۔ ان نفوسِ قدسیہ کو بارگاہِ سلطان الاولیا، میں بڑا  
قرب حاصل تھا۔ وہ خلافت و اجازت کی دولت سے مالا مال تھے۔ انھیں  
میں "حضرت خسرو" بھی تھے۔ مگر ایک انفرادی شان لئے ہوئے۔ مزاج  
اقدس میں بے پناہ اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ سلطان الاولیا، کی بارگاہ  
میں اہم ترین معاملات میں خسرو سفارشی ہوتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ  
سلطان الاولیا، سرکار نظام الحق و الشرع والدین نے ان کی عرضِ اثرت  
کو رد فرمایا ہو۔ وہ اپنے ترک (خسرو) کا ناز اٹھاتے تھے۔ ہر نازک و خطر  
آپ نے خسرو کے بجا اعتماد کی راج رکھی۔

سلطان علاء الدین خلجی کے دو خاص درباروں، ملک نصرت، اور  
محمد علی زنبیلی جو سلطان الاولیاء کے مرید بھی تھے۔ انھوں نے پیرو مرشد  
سے حضرت بربان الدین غریب کی شکایت کر دی۔

» حضور اب آپ کی بارگاہ کے تربیت یافتہ آپ کی صحبت یافت  
مخصوص خلفاء میں بھی تن آسانی اور عیش پسندی آتی جا رہی ہے۔ ابھی  
سے شیوخ کے طریقے پر سجادگی پر بیٹھنے کی مشق شروع ہو گئی ہے۔  
» کیا کہہ رہے ہو تم لوگ! وہ کون لوگ ہیں؟

» حضور والا! ہم بالکل درست کہہ رہے ہیں اب یہی بربان الدین  
غریب کو لے لیجئے۔ دیکھنے میں بالکل مسکین صورت، نیک نفس، شریف النفس،  
عبادت گزار، صاحب تقویٰ اور آپ کے خاص نظاموں میں سے ہیں۔ مگر ان  
کا حال یہ ہے کہ وہ ایک کیبل کو تہ در تہ کر کے اسے ادنجا کرتے ہیں۔ پھر  
مشائخ کے طرز پر اس پر تشریف رکھتے ہیں۔ بھلا ان کو ابھی سے ایسا کرنے  
کی ضرورت تھی؟ وہ پیرو مرشد تو نہیں ہو گئے کہ انداز نشست کو اس طرح  
سے اپنائیں اور سجادہ شیخی پر بیٹھیں۔

یہ سن کر سلطان الاولیاء کے مقدس چہرے پر رنج و ملال ظاہر ہوا  
فوراً خادم خاص کو بلایا۔ » اقبال! «  
جی حضور!

» دیکھو خانقاہ میں بربان الدین غریب بیٹھے ہوں گے ان سے کہو  
کہ وہ یہاں سے فوراً اپنے گھر چلے جائیں اور اب ان کو یہاں آنے کی کوئی  
ضرورت نہیں اور ہاں میرا خلافت نامہ بھی واپس لے لینا  
سخت وحشت کے عالم میں خادم خاص، اقبال غریب کے پاس

گیا۔ اس غریب کو اس غریب پر ترس آ رہا تھا۔ بچا رہے سیدھے سادھے نیک  
خدا ترس سوکھی ہڈیوں کا مجموعہ غریب! واقعی غریب ہو چکے تھے۔  
جھکتے اٹکتے خادم کہنے لگا۔ جناب عالی! سرکار کا حکم نامہ لے کر  
حاضر ہوا ہوں۔

سراپا اشتیاق بن کر: "کیا حکم ہے آقا کا؟"

آپ اپنا خلافت نامہ واپس کر کے ابھی خانقاہ سے چلے جائیں اور پھر  
اب یہاں منت آئیں۔ یہ حکم سناتے ہوئے حقیقتاً بہت افسوس ہو رہا ہے۔  
ملک نصرت اور علی زنبیلی حضرت کی بارگاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ معلوم  
ہوتا ہے کہ انھوں نے ہی کچھ لگائی بھائی ہے۔

اتنا سنتے ہی غریب بدحواس ہو گئے۔ خرمین آرزو پر بجلیاں گر پڑیں  
گریہ بے اختیار نے آنکھوں کو ساون بھادوں بنا دیا۔ آہ! میں تباہ و برباد  
ہو گیا۔ مرکز حیات ہی جب روٹھ گیا تو اب زندگی کس کام کی؟  
برستی آنکھوں سے خلافت نامہ واپس کیا، کبل کا ندھے پر رکھا اور  
لرزیدہ قدموں سے اپنے حجرے کی طرف چل دیئے۔ اب صرف وہ تھے اور  
ان کی گریہ تہناتی! سے

سوکھی ہیں بہت دیر سے پلکوں کی زبانیں  
بس آج تو دل بھر کے رُلائے کوئی آکر

دربار سرکار سے فرصت پا کر کئی دن کے بعد خسرو سلطان الاولیاء کی بارگاہ  
میں پہنچے۔ سب نظر آئے مگر "غریب" نہیں۔ موقع پاتے ہی خادم خاص  
سے پوچھا۔

"اقبال! غریب کہاں ہیں؟"

” اس کا مطلب ہے کہ آپ کو ابھی کچھ نہیں معلوم !!!“  
 ” ارے بھائی پہیلیاں مت بھاؤ ! کیا کوئی حادثہ پیش آگیا اس کو؟“  
 ” حادثہ سے بڑھ کر ! پیر و مرشد نے انھیں خانقاہ سے نکال دیا۔ اپنا  
 خلافت نامہ بھی واپس لے لیا اور خانقاہ میں آنے پر پابندی لگا دی۔  
 ” آخر کیوں؟“

” یہ ملک نصرت اور علی زنبیلی کی شہادت ہے۔ وہ کبیلہ کر کے  
 خانقاہ میں بیٹھے تھے۔ اس کے متعلق کچھ لگائی بھائی کر کے پیر و مرشد کو ناراض  
 کیا ہے۔ اب وہ کہیں نکلتے بھی نہیں۔ بس اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گئے  
 ہیں۔ گھر کے اندر اکثر روتے رہتے ہیں۔ سب لوگوں کو اس حادثہ کا بڑا  
 قلق ہے۔ لیکن حضور کی بارگاہ میں کسی کی ہمت نہیں پڑتی۔ آپ ہی پرسب  
 کی نگاہیں ہیں۔“

خدا گواہ بھری انجن میں میرے سوا

نہیں ہے کوئی جو ان کی نظر کو پہچانے

امیر خسرو ”غریب“ کے گھر تشریف لے گئے۔ دروازے پر دستک دی۔  
 دروازہ کھلا، جیسے ہی خسرو پر نظر پڑی، دوڑ کر پیٹ گئے۔ کہاں تھے میرے  
 بھائی! میرے دوست! یہاں مجھ پر کئی قیامتیں گزر گئیں اور تم اب آئے ہو۔  
 ”غریب! میرے بھائی، تم گھبراؤ نہیں اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔  
 مجھے ملک نصرت اور زنبیلی کی شہادتوں کا علم ہو چکا ہے۔ تم ابھی میرے ساتھ  
 چلو، میں معافی دلوا دیتا ہوں۔“

”نہیں خسرو! نہیں! میرے اندر اتنی ہمت نہیں کہ ناراضگی کے عالم  
 میں قبیلہ عالم کا سامنا کروں۔“

» ارے بھائی تم چلو تو سہی۔ تمہیں کون کہتا ہے کہ تم سیدھے حضرت کے  
روبرو کھڑے ہو جاؤ۔ تمہیں حضرت کے سامنے اس وقت پیش کروں گا جب  
وہ تم سے راضی ہو چکے ہوں گے۔»

دونوں ساتھ ساتھ حضرت سلطان الاولیاء کی خانقاہ میں آئے۔  
غریب کو خسرو نے ایک گوشے میں بٹھا دیا اور خود ننگے سر، ننگے پاؤں، دستار  
گلے میں لپٹی ہوئی عفو و تقصیر کے لئے بحرمانہ انداز لئے حاضر ہوئے۔ خسرو کو  
اس انداز میں دیکھ کر آپ بستم ریز ہوئے سے

یوں مسکرائے جان ہی کیوں میں پڑ گئی  
یوں لب کشا ہونے کے گلستاں بنا دیا

» ترک کیا بات ہے؟ «

» بندہ پرورا غریب کی خطا معاف کر دی جائے! «

» غریب کا قصور تمہیں معلوم ہوا ہے؟ «

» جی میرے آقا! وہ گناہ بے گناہی کا مرتکب ہوا۔

» یعنی وہ تمہاری نگاہوں میں بے قصور ہے، اسے ناگردہ گناہوں

کی سزا دی گئی ہے؟ «

» وہ صفائی کی برات نہ کر سکا۔ ورنہ حضور کی نگاہوں میں بھی

بے قصور ہوتا «

» تو اس کی طرف سے تم صفائی پیش کرنے آئے ہو؟ «

» نہیں اس کی طرف سے خطا کی معافی چاہنے آیا ہوں۔

» جب خطا ہی نہیں تو معافی کا کیا سوال ہے؟ «

» اس کے گناہ بے گناہی کی یہی تفصیل تو حضور والا کی بارگاہ کرام

تک پہنچی ہے کہ بڑھا الدین کبیل تہ کر کے مشائخ کے طریقے پر ابھی سے بیٹھتا ہے۔ بے شک وہ برہان الدین کبیل تہ کر کے اس پر بیٹھتا ہے مگر مجبور ہو کر آپ کی نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ خانقاہ عالیہ میں سوکھی ہڈی کے بنجر کا نام ”برہان الدین غریب“ ہے خصوصاً اس کے پاؤں کی ہڈیاں کس قدر سوکھی ہیں! اپنے پاؤں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کی وجہ سے وہ تنگے فرش پر نہیں بیٹھ پاتا! بس اتنی سی بات کو ہمارے پیر بھائیوں نے افسانہ بنا دیا۔

” اچھا! لیکن وہ دکھائی بھی تو نہیں دیتا۔ آخر کہاں رہتا ہے؟ “

” ابھی حاضر کئے دیتا ہوں۔ “

غریب قدموں پر آگر گر پڑے۔ سرکار عالی نے سینے سے لگایا۔ سینے سے لگاتے وقت ایک غریب کو سلطان فیض و عطا نے جو کچھ عطا فرمایا اسے فوراً دنیائے دیکھ لیا اور آج سات سو سال سے زیادہ ہوا۔ دنیا دیکھ رہی ہے۔ سینے سے لگانے کے بعد نئے سرے سے اجازت و خلافت عطا فرمائی۔ کچھ دنوں کے بعد دولت آباد (دکن) کی طرف مخلوق خدا کی رشد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر سلسلہ عالیہ چشتیہ کو وہ نقطہ عروج عطا فرمایا کہ

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

خلقت اس قدر رجوع ہوئی اور ولایت کا آوازہ اس قدر بلند ہوا کہ آپ کے نام پر بڑھان پور۔ شہر آباد ہوا۔ وہی برہان پور جو دو سال تک عسادل شہابی حکومت کا پایہ تخت رہا۔ جسے مدینۃ الاولیاء، دارالستر و دربار پور شریف بھی کہا جاتا ہے جو مدھیہ پردیس کا ایک عظیم تاریخی شہر ہے۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی داستانیں اس سے وابستہ ہیں۔ اسی لیے اس شہر کی تعمیر و ترقی، تنگ نظری و عصیت کا شکار ہے۔ ورنہ اس کے مقابلے میں



کھڑوہ جو کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، اسے تعمیر و ترقی کے آسمان پر پہنچایا  
 جا رہے۔ لیکن بیچارہ بر بان پور جو ایک عظیم قوم کی داستان عظمت و جلال سے  
 منسوب ہے۔ اس کے ساتھ سوتیلے سلوک برتا جا رہا ہے۔  
 پڑی ہے لاش تعصب کی دورا ہے یہ مگر  
 اک جنازہ ہے جو قوموں سے اٹھائے نہ بنے

**امیر خسرو کون تھے؟** وسط ایشیائی ترکوں کا ایک قبیلہ لاپین  
 سمرقند کے قریب شہر کیش "جو بہت بعد  
 میں شہر "سنز" کہلایا۔ جسے امیر تیمور کے شہر سنز سے زیادہ شہرت ملی۔ وہ  
 چنگیزی حملوں کے درمیان وطن سے بے وطن ہو کر بلخ میں آسا۔ ۱۲۲۰ء  
 میں تاتاریوں کا ایک زبردست لشکر خود چنگیز خاں کی قیادت میں سمرقند و  
 بخارا کو تباہ و برباد کرتا ہوا بلخ کی طرف بڑھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارہ سو مسجدوں  
 والے اس عظیم اسلامی شہر میں ایک سال بعد کوئی دیا جلانے والا نہیں رہ  
 گیا۔ امیر سیف الدین محمود اپنے قبیلے کی ایک شاخ "ہزارہ" کے سردار تھے  
 حملے کے وقت بلخ چھوڑ کر ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ عالم اسلام پر چنگیز  
 غائب نے ہندوستان کو پناہ گزینوں کا مسکن بنا دیا تھا۔ ادھر کے اجرے  
 ہوئے بہترین شہسواروں، مدبروں، دانشوروں اور اصحاب علم و فضل  
 کے لئے بالغ نظر درویش صفت بادشاہ شمس الدین التمش کے دروازے  
 کھلے ہوئے تھے۔ انھیں پناہ گزینوں میں سیف الدین محمود بھی تھے۔ ابتدا  
 چند سال معمولی خدمتوں میں گزرے۔ بعد میں انھیں مقرر اسے ایٹھ جانے والی  
 شاہراہ پر گنگا کے کنارے پٹیالی عرف مومن آباد قصبے میں ایک چھوٹی سی جاگیر  
 عطا ہوئی۔ سیف الدین محمود کی شادی ایک ہندوستانی امیر عباد الملک کی بیٹی دونازہ ہوئی

چار بچے یعنی ایک بیٹی، تین بیٹے تولد ہوئے۔ یمن الدین محمودان میں بچھلے تھے جو ۱۲۵۲ء تا ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے جو اپنے تخلص اور موروثی خطاب "امیر" کی بدولت "امیر خسرو" کہلائے۔ امیر خسرو کی شہرت اتنی ہوئی کہ اصل نام دب گیا۔

اس مختصر توضیح سے معلوم ہوا کہ آپ ہندی الاصل تھے۔ جیسا کہ آپ کا یہ شعر بھی دلالت کرتا ہے۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جو اب  
شکرِ مصری ندارد دگر عرب گویم سخن  
آٹھ سال کی عمر میں پدر بزرگوار کی شفقتوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ نانا امیر عماد الملک نے آپ کی خصوصی تربیت و پرورش کی۔ عماد الملک حکمت وقت کے چار بڑے ستونوں میں سے ایک تھے۔ ۷۰ سال غرض ممالک (سکرٹری محکمہ بخشی گری) رہے۔ دو سو ترک غلام، دو دو ہزار سپاہی غلام، ہزار سواران کے جھنڈے تلے رہتے تھے۔ پچاس آدمی تو صرف ان کے پاندان، خاقدان پر ملازم تھے۔ بڑے مخیر، سخی حاتم تھے۔ ایسے صاحبِ حسنت و منصب و جاہ کے نواسے..... یمن الدین خسرو محمود تھے۔

بیس سال سے کم عمر میں انھوں نے ایک دیوان "تحفہ القاری" لکھا، اور عمر کی بیسوس بہار پر پہنچ کر جب وہ کسبِ معاش اور فکری روزی میں نکلے تو شاعرانہ شہرت اور ایک بہترین دیوان ان کے ساتھ تھا۔ عملی زندگی میں سب سے پہلے سلطان بلبن کے شاہِ خرچ بھتیجے علاء الدین کشلو عرف ملک چھجو کی ملازمت اختیار کی۔ دو برس وہاں رہ کر سلطان بلبن

بیٹے بفر اہاں سے شناسائی حاصل کی۔ بفر اہاں سامانہ کا حاکم تھا جسے بعد میں ریاست پٹیالہ کہا گیا، امیر خسرو علاء الدین کشلو کی ملازمت چھوڑ کر بفر اہاں کے پاس سامانہ آگئے۔ ناصر الدین بفر اہاں نے خسرو کو اپنا ندیم بنایا یہیں انھوں نے پنجابی زبان سیکھی اور اس کے لوگ گیتوں کی لئے۔ ۱۲۷۹ء میں حالات نے انھیں بنگال کے صدر مقام لکھنوتی پہنچا دیا۔ مگر وہاں آپ زیادہ دن نہ رہ سکے، واپس دہلی آگئے۔ سلطان بلبن کے سپہ سالار ولی عہد بیٹے سلطان محمد قآن سے رابطہ قائم کیا۔ ۱۲۸۰ء میں شہ زادے کی خدمت میں ملتان حاضر ہوئے، کلام سنایا۔ اس قدر پسند کیے گئے اور اس انداز میں پذیرائی ہوئی جو خسرو کے وہم و گمان میں نہ تھی۔

پنجاب سندھ دونوں کے لیے ملتان فوجی چھاؤنی تھا۔ علماء شعراء، ادباء، اولیاء، اصفیاء، اتقیاء، کا گڈھ۔ اس کے علاوہ عراق، عرب کے موسیقاروں کا جگمگٹا تھا۔ شہزادہ سلطان محمد قآن ذی علم، صاحب فکر و نظر، بہادر، فیاض، شاعری و موسیقی کا دلدادہ، شمشیر و سنان، طاؤس و رباب دونوں میں بے مثل تھا۔ اس کا دربار خسرو کیلئے بہترین تربیت گاہ ثابت ہوا۔ یہیں امیر خسرو نے اپنا دوسرا دیوان ”وسط الحیوة“ ترتیب دیا۔ یہیں قول (حدیث) کے عربی لحن کو موسیقی سے جوڑا جسے بعد میں قول قلیانہ سے شہرت ملی۔ یہیں عربی اور ترکی سازوں کو پنجاب کے لوگ گیتوں کے لئے استعمال کیا۔ یہیں انھوں نے عربی وفقہ کی تحصیل و تکمیل کی اور بتیس قصیدے سلطان محمد کی شان میں لکھے جو اب تک کسی کے لئے نہیں لکھے تھے۔ پہلی بار انھیں ایک لائق بہادر و فیاض، سیر چشم، جوہر شناس، قدر داں مدوح ملا تھا۔ منگولوں

کے ساتھ ایک زبردست معرکے میں سلطان محمد شہید ہو گیا۔ خسرو بھی گرفتار ہوئے مگر بہزار خرابی بسیار وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ واپس دہلی آگئے۔ کچھ دن وہاں رہ کر ماں اور عزیزوں کے ساتھ اپنے آبائی وطن پٹیالی آگئے۔ اور وہیں رہنے لگے۔ مگر دلی کے درباری حالات پر برابر نظر نہ ہی، امراء کی سازش، سیاسی داؤں و پیچ، حالات کے اتار چڑھاؤ سے برداشتہ خاطر ہو کر امیر علی مرجاندار حاتم خاں سے وابستہ ہو گئے۔ دو سال اودھ میں رہے۔ برج بھاشا، اودھی بول چال، وہاں کی اپنی لوح دار تہذیب، مخصوص انفرادیت، نفاست، نزاکت تو بہت پسند آئی مگر زیادہ دن دلی سے دور نہ رہ سکے۔

جیسے ہی دلی پہنچے، سلطان معز الدین کی قیادت نے بلا بھیجا۔ خاطر خواہ قدر افزائی کی۔ تین ہزار نو سو چوالیس اشعار پر مشتمل مشنوی «قران السعدان» چھ ماہ کے بعد مکمل کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ مشنوی کئی حیثیتوں سے نہایت ہی اہم ہے۔ باپ بیٹے کی تاریخی ملاقات جو قتل و غارت گری کے بجائے شفقت و محبت میں بدل گئی۔ خسرو اس کے چشم دید گواہ تھے۔ سلطان نے جی کھول کر داد دی۔ خوب انعام و اکرام سے نوازا اور ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا۔

معز الدین کی قیادت کے بعد جوڑ توڑ کی سیاست نے عنان حکومت جلال الدین خلجی کو دی۔ اس کے مختصر دور حکومت میں خسرو مقرب بارگاہ سلطانی تھے۔ یہاں تک کہ فوجی مہمات میں بھی ساتھ ساتھ رہتے۔ اس کی جنگی مہموں کی یادگار میں ایک مشنوی «مفتاح الفتح» لکھا۔ سلطان جلال الدین خلجی کا عہد اس حیثیت سے خسرو کے لیے بڑا مبارک رہا کہ

اس کے مختصر عہد حکومت میں خسرو کو سلطان الاولیاء کی بارگاہ میں زیادہ سے زیادہ موقع عاجزی کا نصیب ہوا اگرچہ حضور محبوب الہی کی غلامی میں عہد طفلی ہی سے آگے تھے مگر کسب معاش اور دربار سرکار سے انھیں ایسے مواقع کم میسر ہوئے۔ اسی بادشاہ کے عہد میں آپ نے اپنا سب سے اہم دیوان «غزوة الجمال» اپنے صاحب نضر اور بزرگ دوستوں کے مشورے پر ترتیب دیا۔ یہ پہلا دیوان تھا جس میں حمد الہی و نعت مصطفائی کے بعد بادشاہ کی تعریف سے پہلے اپنے پیرو مرشد سلطان الاولیاء حضرت سید نظام الدین محبوب الہی کی مدح فرمائی۔

۱۶ رمضان المبارک ۶۹۵ھ بروز بدھ، بوڑھے، نرم رو، نرم خوا، کرم کشا، رحمدل، چشم پوش، کشادہ دل، بکشادہ مزاج، کشادہ ظرف، خوش مزاج، خوش خصال، خوش اطوار بادشاہ سلطان جلال الدین خلجی کو اس کے سگے داماد، سگے بھتیجے، اور پروردہ نعمت نے دھوکے سے قتل کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

اس نے اپنے پیش رو معز الدین کی قباد اور جلال الدین خلجی کے برعکس بلبن کی سخت گیر، بے لوج اور غیر شاعرانہ پالیسیوں کو اپنایا اور بیس سال تک بڑی شان و شوکت، بڑے کروفر، بڑے جاہ و جلال اور شاہانہ طمطراق سے حکومت کی اور اپنے عزم و یقین، فاتحانہ حوصلے اور زبردست تسخیری قوت کی بدولت وہ ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گیا۔ ایسے سخت گیر، کھردرے اور غیر شاعرانہ مزاج رکھنے والے بادشاہ کے یہاں بھی خسرو کا منصب و وظیفہ برقرار رہا۔ اس نے خسرو کو اپنی درباری زینت بنائے رکھا۔ سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتا۔

اپنے اور سلطان المشائخ کے درمیان انھیں رابطے کی ایک کڑی سمجھتا۔ سلطان الاولیاء کی بارگاہ سے خسرو ہی کے ذریعے رابطہ قائم رکھتا اور ہر کڑے وقت اور کڑی آزمائش میں آپ کی دعاؤں کا طالب رہتا۔

دورِ علانی آپ کی شاعری کا نقطہ عروج ہے۔ اس کے عہد میں کئی مثنویاں اور نغمے لکھے۔ مثنوی یسلیٰ جنوں اسی عہد یعنی ۲۹۹ھ کی یادگار ہے۔ عہدِ علانی کو بارہ برس تک پرکھنے کے بعد اپنے قلم کا پہلا نثری سرمایہ «خزائن الفتوح» لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ علاء الدین خلجی کے دور کی شمالی و جنوبی فتوحات کی ایسی منہ بولتی تصویر ہے کہ اس کا نام ہی «تاریخِ علائی» پڑ گیا۔

عہدِ علانی ہی میں آپ نے سلطان المشائخ کے اقوال کو «فضل الفوائد» کے نام سے قلمبند فرمایا۔ جو آج تصوف کی راہ کا سنگ میل ہے اور نفحات الانس، فواید الفوائد، سیر الاولیاء، تذکرۃ الاولیاء، طبقات الاولیاء، اخبار الاعجاز اور تاریخ فرشتہ وغیرہم ہی کی طرح ایک ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضخیم نثری تصنیف «رسائل الاعجاز» بھی دورِ علانی ہی کی دین ہے۔

پھر ہندوستان کی بساط سیاست پر نئی چالیں چلی گئیں۔ ادھر قصر ہزارستون میں علاء الدین نے جانِ جان آفریں کے سپرد کی ادھر سازشیوں کی چال نے اس کی مضبوط ترین حکومت کے تانے بانے بکھیر کر رکھ دیئے۔

علاء الدین خلجی کے بعد قطب الدین مبارک شاہ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ مگر نوجوان بادشاہ نے عیش و طرب، ظلم و بربریت، سفاکی و خونریزی، اپنوں کو دشمن بنانے کے علاوہ ایک بے حد طردار حسین، رعنا، اور خوبصورت، یادو قبیلے کے حسن نامی نوجوان کے ساتھ عشق نہیں ہو سکا۔

۶۲  
 رانی اور اس کے ساتھ عیش و طرب میں بڑا بدنام ہوا۔ بالآخر ۱۳۲۰ء  
 مطابق ۱۳۲۰ھ جمادی الثانی کی چاند رات کو اپنے اسی شریک بزم عیش و  
 نشاۃ کے ہاتھ بیدردی سے قتل ہوا۔ خاندان نملانی کے کسین بچوں تک  
 کو چن چن کر قتل کر دینے کے بعد خسر و خاں کے لقب سے تخت نشین ہوا  
 پھر تو اضطراب و بے چینی کا ایک نیا دور شروع ہوا بالآخر تاریخ نے  
 ایک اور کروٹ لی۔ غازی ملک تغلق نے سخت خونریزی کے بعد اسے  
 شکست دے کر قتل کیا اور حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

خسر و اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ دربار تغلق کی زینت بن گئے  
 اور وہ بیل ہزار داستان، وہاں بھی نغمہ سنج ہوا۔

تاریخ کا یہ اجمالی پس منظر بیان کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ  
 خسر و کی عظمتوں کے نقطہ عروج کا پس منظر سمجھ میں آجائے۔ ساہیاد شاہوں  
 کے درباری شاعر، ان کے مزاج میں اثر و رسوخ رکھنے والے اتنی عظمتوں،  
 رفعتوں اور آفاقی شہرتوں کے حامل خسر و سلطان الاولیا، سرکار محبوب الہی کے  
 بند بے دام تھے۔

سلطان الاولیا، ہر ایک کو بے حیل و حجت شرف بیعت سے نوازتے  
 دامن محبوبیت ہر ایک کے لئے کشادہ تھا۔ سیہ کار، گنہ گار، نیکو کار، امیر،  
 غریب، فقیر، رئیس، درویش سب ان کے دامن گرم سے وابستہ ہوتے خسر و  
 عشاء کی نماز کے بعد حاضر بارگاہ ہوتے۔ شہر بھر کی خبریں اور درباری حالات  
 سناتے۔ اس کے بعد محفل سماع منعقد ہوتی سلطان المشائخ کی طرف  
 غلوک کا بے پناہ رجوع اور ہر دل عزیز بزمی، حکومت اور بادشاہ سے بے تعلق  
 نیازی اور خاسدین کی لگائی بھائی سے غیاث الدین آپسے بدگمان

ہوا۔ ایک بار حکم دیا کہ آپ دربار میں اگر سماع کے متعلق وضاحت کریں۔ علمائے دین کی طرف سے اعتراض ہو رہا ہے۔ آپ اپنے خدام اور رفقاء کے ہمراہ بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے۔ کتابی علماء اور بادشاہ کو بدلائل احسن مطہین کیا۔ بادشاہ نے واپسی کی اجازت میں نہ تو سماع کے متعلق کچھ منع کیا اور نہ ہی اُسی چھوٹ دی مگر اس قدر باوقار رہے نیازاً نہ انداز میں آپ کا بادشاہ کے دربار سے واپس آنا اسے بہت کھل گیا۔ رفتہ رفتہ یہ ناگواری، سوئے ظن و حسد کے سرحد میں داخل ہو گئی۔ بالآخر جلا پاتا بنا بڑھا کہ ۱۳۲۳ء میں بنگال کی مہم پر جانے وقت کہلو ابھیجا کہ میری واپسی تک دلی چھوڑ دیں۔

اس مہم میں خستہ و کجی سلطان کے ہمراہ تھے۔ بنگال سے واپسی پر پھر ایک بار قاصد بھیجا کہ میرے آئیے پہلے پہلے دلی چھوڑ دیں آپ کے خدام و اہل محبت میں تشویش و اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مگر آپ بڑے پرسکون تھے بڑے اطمینان بھرے بچے میں فرمایا: «سنوڑ دلی دور است» (ابھی دلی دور ہے) یہ تاریخی جملہ بعد کو کہاوت بن کر آپ کی خدادیدہ زبان حق ترجمان سے نکلا تھا جو بے ادب، بدنصیب تغلق کی تقدیر بن گیا ہے

تَغْتَةُ اَوْ كَفْتَةُ اللّٰهِ بُوَد

گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

غیاث الدین تغلق کو دلی آنا ہی نصیب نہ ہوا۔ ۱۳۲۳ء کی آخری تاریخوں میں دلی شہر سے باہر بیٹے نے باپ کے استقبال و اعزاز کے لیے ایک لکڑی کا شاندار محل بنوایا۔ سعادت مند بیٹے نے فتح مند باپ کا اسی طرح استقبال کیا۔ باپ نے بیٹے کے دسترخوان پر کھانا کھایا۔ اسی رات محل کی چھت زین بوس ہوئی۔ غازی ملک تغلق اپنے انجام کو پہنچا۔ اللہ کے ایک



برگزیدہ بندے کی دلازاری کی اسے بڑی قیمت دینی پڑی ہے

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو  
ید بیضاً لے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

۱۶ ربیع الثانی ۱۲۵۵ھ کو سلطان المشائخ سیدنا سرکار محبوب الہی

نظام الدین اولیاء نے اپنے سب سے زیادہ صاحب تقویٰ مرید و خلیفہ حضرت  
سید نصیر الدین چراغ محمود کو خلافت و جانشینی عطا فرما کر داعی اجل کو لبیک کہا۔

حضرت امیر خسرو اس وقت بادشاہ کے ہمراہ بنگال میں تھے۔ جوں ہی یہ خبر  
وحشت اثران تک پہنچی، جو اس باختر ہو گئے۔ ملازمت سے استعفاء دیدیا۔

بھاگ بھاگ دہلی پہنچے، زار و قطار روتے ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ یہ کیسی عجیب

بات ہے کہ آفتاب زیر خاک سو گیا اور خسرو ابھی زندہ ہے۔ سر کو پتھروں سے

ٹکراتے رہے ہے

اب ہم ہیں اور یا تم ایک شہر آرزو!

ٹوٹا وہ آئینہ کہ جو تمثال دار تھا

یہ کیفیت چھ ماہ تک رہی۔ یہ کھانے کا ہوش، نہ تن کی خبر۔ دن رات روتے

رہتے۔ اکثر رات کو اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روتے کہ دیکھنے والوں کو ترس آنے

لگتا۔ ٹھیک چھ ماہ بعد اسی دن اسی تاریخ کو قبر النور پر سر رکھا، سرد آہ کھینچی،

زور سے یہ دُوبا کہا ہے

گوری سوئے سچ پر منہ پر ڈالے کیس

چل خسرو گھر اپنے سنا بچھ بھٹی چو دیس

اور جان جاں آفریں کے سپرد کر دی ہے

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی : حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پوری دنیا ایسی محبت کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ محبت ہی کی جلو آرائی تھی کہ حضرت سلطان الاولیا، فرمایا کرتے تھے جسے میری قبر پر آنا ہو تو خسرو کی قبر پر حاضری دے۔ سات سو سال سے زائد ہو گئے، یہ رسم جاری ہے۔ عوام و خواص سبھی پہلے خسرو کی بارگاہ عشق میں حاضری دیتے ہیں۔ اس کے بعد محبوب الہی کی چوکھٹ کو چومنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

تاریخ فرشتہ کے مطابق :- "خسرو جیسا انسان آج تک خاک ہند پیدا نہ کر سکی" سے

اے عشق ترے صدقے جلنے سے چھٹے سنتے  
جو آگ بجھا دے گی وہ آگ لگائی ہے

# بِزبانِ حکایت شہزادی

جمال و زیبائی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ حیا آلود انداز لے جب دوشیزگی کے پیر میں ڈھلتی ہے تو ماحول کو سرگوشیوں کی زبان بل جاتی ہے۔ حمیدہ اوصاف پاکیزہ صفات کی اضافی خوبیاں اور معنوی تقدس، تابانی حسن اور رعنائی، شباب کی سحر آفرینی اس کی تسخیری قوت کو دوچند کر دیتا ہے۔ کرمان شاہ کا وہ گل رعنا، نسوانی وقار کی آبرو اور اس کے حسن کا نمائندہ و ترجمان بن کر جب شباب کی دہلیز پر پہنچا تو آبشاروں کا ترنم، نغمہ بارغیچوں کا تبسم مشکبار پھولوں کی نزاکت شرمسار اور کہکشاں کا جمال ڈھنگ رنگ ہو گیا ہے

رُٹے تاباں زلف مشکیں قامت رعنائی سرا

سرو ہے، سنبل ہے اور خوب شید عالم تاب ہے

ایران میں دشت لوط کے مشرقی جنوب میں کرمان شاہ نانی جگہ آج بھی موجود ہے دو صدی ہجری (۱۱۷۷ء) میں وہاں پر شاہ شجاع کی حکومت تھی جو آن رعنا شہسوار، بہادر سیر و شکار کا رسیا، عیش و طرب کا دلدادہ، فخر امر و سے دور، اندیشہ ہائے فردا سے بے نیاز، گھوڑ سواری میں اس قدر ماہر کہ ابوالفوارس اس کا لقب۔

اس کے عیش و طرب کا سلسلہ دن رات یونہی جاری تھا۔ حیات

اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس کے گرد رقص کناں تھی۔ ایسے تنگ دامن میں زندگی کی تمام مسرتیں سمیٹے ہوئے تھیں۔ سیر و شکار ہی اس کے حیات کا حاصل تھا گو یا وہ ع

بابر بہ عیش کوشش کہ عالم دوبارہ نیست

کی عملی تفسیر تھا کہ اسی اثنا میں اس پر ابدی سعادتوں کا دروازہ کھلا، روح کی بہاروں کا موسم آیا، گل قدس کی خوشبو اڑی، اس کے رُوح کی ارجندی کے نقطہ عروج کا آغاز اس طرح ہوا کہ دوران شکار ایک مرد غیب کی ہلکی سی تشبیہ نے اس کے کائناتِ دل کو زیر و زبر کر ڈالا۔ اس کا دل دنیا کی رنگینوں سے اس طرح اچاٹ ہو گیا کہ وہ فوری طور پر تخت و تاج سے دستبردار ہونے کا اہم ترین فیصلہ کر ڈالا۔ گھر پہنچتے ہی اہل خاندان کو اکٹھا کیا اور ان پر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ ”پورے خاندان اور محل میں اس فیصلے سے کھلبلی مچ گئی۔ ہزار دباؤ، ہزار ہمائش، منت و سماجت، الحاح و زاری کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہا۔“

اٹھتی نہیں نگاہ کسی اور کی طرف  
پابند کر گئی ہے کسی کی نظر مجھے

چھوٹے بھائی نے بڑے ادب سے عرض کیا ”بھائی جان! عجلت میں کوئی فیصلہ اور وہ بھی اتنا بڑا دیرپا نہیں ہوتا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو اپنے اس فیصلے پر افسوس کرنا پڑے۔ اس لئے جلدی نہ فرمائیں، کچھ دن رک کر خوب غور و خوض کر لیں۔“ جانِ برادر! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ افسوس تو اس بات پر ہے کہ عمر کا اتنا قیمتی حصہ ضائع ہو گیا۔ حیاتِ مستعار کی چند سانسیں اور باقی رہ گئی ہیں کیا پتہ وہ کب ٹوٹ جائیں۔ اور ابھی ہم نے

اپنی آخرت کے لیے کچھ کیا ہی نہیں۔ تم تخت و تاج سنبھالو، یہ تمہیں کو مبارک ہو  
اب میں ایک دن بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ پھولوں کا یہ سیج میرے لئے کانٹوں  
کا بستر بن گیا ہے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب لکی کلی کھلتی ہی نہیں  
لے فصل بہاراں رخصت ہو ہم فصل بہاراں بھول گئے

شریک خیات نے ڈڈبائی آنکھوں سے عرض کیا۔ "میرے سرتاج!  
ایک دم سے فیصلہ کرتے وقت میرا اور اس نازک سی پچی کا جس نے ابھی شاہی  
محل میں صرف آنکھیں کھولی ہیں، خیال کر لیا ہوتا۔ ہماری شہستان محبت  
کا یہ مسکراتا ہوا پھول جسے پھولوں کا سیج اور لطیف آغوش ہی ملے ہیں اس  
کا کیا ہو گا؟"

"ارے نیک بخت! چرندوں، پرندوں، درندوں کو اور کیڑوں مکوڑوں  
تک رزق عطا فرمانے والا رب کیا ہمیں چھوڑ دے گا؟ دنیا میں پھیلے ہوئے  
کر وڑوں مخلوق جس میں اس کے فرماں بردار، نافرمان اور باغی سب شامل  
ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ انہیں بھی اپنے فضل سے رزق عطا فرماتا ہے جو سر سے  
ہی اس کے وجود کے منکر ہیں تو کیا ہمیں وہ اپنے فضل سے محروم رکھے گا۔ جبکہ  
ہم صرف اسی کے لئے تخت و تاج چھوڑ رہے ہیں ع

دوستاں را کجا کنی محروم  
چونکہ بادشمنان نظر داری

ویسے تمہیں اختیار ہے۔ اپنی اور بچی کے بہتر مستقبل کے لئے  
شاہی محل میں رہ جاؤ یا آزمائش کی اس کڑی دھوپ میں میرا ساتھ دو۔  
میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا کہ دنیا جہاں کی مشقتیں جھیلنے میں بھی تم میرا

ساتھ ضرور ضرور دو، نہیں نہیں میرے سرتاج! جب میں بزمِ عیش و طرب میں اور مسرتیں سمیٹنے میں آپ کے ساتھ تھی تو دنیا کا دکھ بھیلنے کے لئے میں تنہا آپ کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ میں رفیقہ حیات ہوں، رفیقہ عیش و نشاط نہیں۔ میرا مرنا جینا آپ کے ساتھ ہے جو آپ اپنے لئے پسند کریں، وہی میرے لئے بھی پسند فرمائیں۔ میرے لئے وہ جھونپڑا ہی شاہی محل ہو گا جہاں آپ ہوں گے۔

دیکھیں گی بھی اب کس کو تیرے بعد یہ آنکھیں  
میں تجھ سے بچھڑ کر رہوں گی شہر میں تنہا

اطاعتِ شعار، فرماں بردار، پیکرِ وفا اور سعادت مند بیوی کے جواب نے حوصلوں کو بڑی توانائی بخشی، بالآخر سارے محل کو روتا بلکتا چھوڑ کر حکومت اپنے چھوٹے بھائی کو سپرد کر کے اپنی بیوی اور بچی کو لے کر محل سے باہر نکل آئے اور اسی شہر کی مضافات کی بستی میں ایک معمولی سا مکان بنا کر رہنے لگے۔ ایک عام اور معمولی انسان کی طرح یادِ خدا اور خدمتِ خلق سے جو بھی وقت بچتا اسے رزقِ حلال کی سعی و حصول میں گزارتے، عبادتِ ریاضت، صبر و قناعت، حرم و اتقا، اور شدید مجاہدہ نفس باحفوصِ فضلِ خداوندی کی بدولت آپ کا شمار خاصانِ خدا اور اس کے مقبول ترین بندوں میں ہونے لگا۔ لوگوں کی نگاہوں میں آپ کا احترام اور شدید تر ہو گیا۔ دوسرے طبقے کے مشائخین میں آپ کا شمار ہے۔ ابو بخش حداد، ابو تراب بخشی، ابو عبد اللہ ذراع بصری، ابو حفص نیشاپوری، ابو عیسیٰ بصری قدست اسرار ہم وغیر ہم کے بمعصرو ہم صحبت میں۔ حضرت ابو عثمان جبری کے پیروم راشد ہیں۔ مکمل چالیس سال تک طبیعت کے تقاضے

پر نہیں سوئے، آنکھیں جب نیند سے بوجھل ہونے لگتیں تو آپ اُن میں نمک  
 بھر لیتے۔ چالیس سال کے بعد ایک بار سوئے تو خواب میں حق تعالیٰ شانہ کو دیکھا  
 عرض کیا مولیٰ میں نے تجھے بیداری میں بہت تلاش کیا مگر تجھے خواب میں  
 پایا۔ ندا آئی کہ یہ اسی بیداری کا معاوضہ ہے پھر تو آپ نے سونے کو اپنا  
 معمول بنالیا کہ شاید پھر اسی بہانے سے جلوہ بے نیاز کا نظارہ ہو جائے۔ آپ اپنے  
 خواب پر اس قدر فرحان و نازاں و شاداں تھے کہ فرمایا کرتے تھے: اگر دونوں  
 جہان اس خواب کے بدلے مجھے غطا کیا جائے تو بھی مجھے منظور نہیں۔ اس  
 مقدس اور عظیم ترین خواب سے جب بیدار ہوئے تو یہ شعر آپ کی زبان  
 پر جاری تھا ہے

سَأَيْتُكَ فِي الْمَنَامِ سُرُورٌ عَيْنِي

فَأَجَبْتُ التَّعِيشَ وَالْمَنَامَا

”اے میرے چشم مسرت کے سرمائے میں تجھے خواب میں دیکھا اسی  
 لئے اب سونے اور آرام کرنے کو دوست رکھتا ہوں“ پھر جب دیکھو آنکھیں  
 بند کئے پڑے ہیں۔ دیکھنے والا یہ محسوس کرے کہ سو رہے ہیں۔ حالانکہ اس  
 سے مقصد صرف مشاہدہ حق تعالیٰ شانہ ہوتا ہے۔ گویا مجنوں کے اس شعر  
 کے مطابق ہے

وَلَا بِي لَا سَتَعَشِي وَمَا لِي غِيْشَةٌ

لَعَلَّ خِيَالَاتِكَ يَلْقَى خِيَالَكَ

”میں خود کو بے خودی (یعنی سونے) کی حالت میں رکھتا ہوں۔ حالانکہ  
 سوتا نہیں۔ صرف اس امید پر آنکھیں بند ہوتی ہیں کہ تمہارا سراپا لے ناز  
 ہی میرے تصور کو آباد کرے“

اُن کی آمد کا تصور روح پرورد ہے مگر

دیکھئے کب ٹوٹتا ہے یہ طلسم انتظار

یہی معاذ رازی کی کتاب غنا کی فضیلت کے رد میں آپ نے فقر  
فضیلت لکھی اور بدلائل احسن ثابت کیا کہ فقر غنا سے افضل ہے آپ کی تصانیف  
میں «مرآة الحكماء» کافی مشہور ہے۔ حضرت ابو حفص نیشاپوری سے قیمتی  
قبائیں ملبوس کوئی سوال پوچھا آپ نے فرمایا خدا کی قسم تو شاہ ہے! شاہ  
شجاع نے عرض کیا جی ہاں میں شاہ ہوں کیونکہ ایسا سوال میں ہی کر سکتا  
تھا۔ فرمایا تم شاہ ہو اور قیمتی قبائیں؟ شاہ نے جواب دیا وَجَدْنَا فِي  
الْقُبَلِ مَا طَلَبْنَا فِي الْعَبَاءِ جسے گڈری میں تلاش کیا اُسے قبائیں پایا۔  
ایک دن شاہ شجاع مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک سائل نے دو سیر روٹی  
کا سوال کر دیا۔ آپ کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ بیٹھے تھے مگر کسی نے سائل  
کا سوال پورا نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کون ہے جو دو سیر روٹی کے بدلے میرے  
پچاس حج خریدے؟ مجلس میں ایک عالم دین بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں یہ بات  
بہت ناگوار معلوم ہوئی انھوں نے کہا: شیخ محترم! حج اسلام کا ایک اہم  
رکن ہے اس کی یہ بے توقیری، استخفاف شریعت ہے۔ دو سیر روٹی میں  
پچاس حج! ہرگز نہیں! جب مجھے خود ہی اپنی قیمت نہیں معلوم تو میرے عمل و  
کردار کی قیمت کیا ہوگی؟

حضرت یحییٰ بن معاذ ایک زبردست خطیب اور وعظ گو تھے۔ آپ کے

وعظ میں بڑی تاثیر تھی۔ چنانچہ نیشاپور میں آپ نے بڑا پر تاثر وعظ کہا۔ جس

میں سات آدمی جاں بحق ہو گئے۔ «ہری» ایک مقام کا نام ہے۔ حاکم

ہری کی لڑکی کی فرمائش پر آپ نے چار دن وہاں پر وعظ کہا۔ آپ کے



وَعظ کا ایسا اثر ہوا کہ چاروں میں ۴۵ آدمی آپ کی مجلس وعظ میں جاں بحق ہو گئے یہی یحییٰ بن معاذ حضرت شاہ شجاع کے گہرے دوستوں میں تھے۔ اتفاق سے کسی شہر میں دونوں جمع ہو گئے۔ حضرت یحییٰ نے آپ کو اپنی مجلس وعظ میں شرکت کی دعوت دی لیکن آپ تشریف نہیں لے گئے ان کے تالیف قلب کے لئے ایک بار ان کی مجلس وعظ میں تشریف لے گئے۔ ان کی لاعلمی میں چھپ کر ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ اس وقت حضرت یحییٰ وعظ گوئی میں مشغول تھے کہ اچانک زبان بند ہو گئی۔ کوشش بسیار کے بعد بھی جب زبان نہیں کھلی تو فرمایا کہ شاید اس مجلس میں مجھ سے بہتر کوئی واعظ موجود ہے کہ جس کے تصرف نے میری زبان بند کر دی ہے۔ یہ سن کر آپ سامنے آئے اور فرمایا کہ میں اسی وجہ سے آپ کی مجلس وعظ میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اہل فضل و ولایت کا فضل و ولایت اسی وقت تک قائم رہتا ہے کہ جب تک وہ اپنے کو صاحب فضل و ولایت تصور نہیں کرتے۔ فرمایا کہ فقرا ایک سرالہی ہے۔ فقرا جب تک اسے پوشیدہ رکھتے ہیں امین ہوتے ہیں اور جب افشائے راز کر دیتے ہیں تو ان سے فقر چھین لیا جاتا ہے۔ فرمایا صدق کی تین علامتیں ہیں۔ اول دنیا سے نفرت، دوم مخلوق سے دوری، سوم خواہشات نفس پر غلبہ۔ فرمایا صبر کی تین علامتیں ہیں۔ ترک شکایت، صدق رضاء، اور قبولیت رضاء۔ فرمایا میری مثال اس زندہ مرغ سی ہے جس کو سیخ پر لگا کر آگ پر رکھ دیا جائے اور چاروں طرف سے آگ لگا دی جائے

جلیل آساں نہیں آباد کرنا گھر حبت کا  
یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

زندگی حسب معمول رواں دواں تھی۔ منہ و نجوم کی گردش بھی اپنی جگہ جاری و ساری تھی کہ ایک دن مضافات کی اسی بستی میں کہ جس میں آپ کا گھر تھا ہٹو پچو کے شور کے ساتھ شاہی سواری بڑے گرو فر اور شاہانہ طمطراق کے ساتھ آپ کے معمولی مکان پر اتری۔ سلطان نے بڑھ کر دست بوسی کی سعادت حاصل کی اور ایک گوشے میں ادب سے بیٹھ گیا۔ شاہی سواری دیکھ کر آپ کو بڑی وحشت ہوئی مگر بادشاہ کی سعادت سے آپ کو خوشی ہوئی دوران گفتگو بادشاہ نے ادب اور فریضے کے ساتھ عرض کیا تا یا حضور ایک طویل عرصہ ہوا ہم لوگوں سے آپ کو جدا ہوئے مگر کبھی آپ نے ملاقات کے لئے بھی قدم رنج نہ فرمایا۔ آخر ہم آپ کے حقیقی عزیزوں میں سے ہیں ہمارا خون بھی ایک ہی ہے۔ اس پر بھی نہ تو آپ نے خود پلٹ کر خبر لیا اور نہ ہی اپنے احوال کی خبر ہونے دی۔ ابا حضور نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ وراثت میں یہ حکومت مجھے ملی ہے لیکن مجھے یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اس پر اصل حق آپ ہی کا ہے۔ آپ جب چاہیں واپس تشریف لائیں۔ مجھے انشاء اللہ تعالیٰ آپ ایک سعادت مند بیٹا پائیں گے۔

کیسے کریوں میں بتا ترک تعلق کا یقین

تیری یادوں سے ابھی بوئے وفا آتی ہے

آپ نے جواباً فرمایا بیٹا! جس حکومت کو میں نے ایک بار لات ماردی اس کے متعلق اب سوچنا ہی فضول ہے۔ اس عذاب مسلسل کو بہت کچھ سوچ کر میں نے چھوڑا تھا اور میں اپنے اس فیصلے پر آج بھی خوش ہوں۔ لہذا اب اس کا ذکر ہی بے کار ہے۔ یہ تخت و تاج اور شوکت اقتدار تمہیں مبارک ہو۔ دوران گفتگو بادشاہ کی نظر ایک سرور قد لارخصاً

حسن فروزاں پر پڑی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی وہی چچا زاد بہن ہے جو شاہی محل میں پیدا ہوئی تھی جو نہ صرف یہ کہ شہزادی تھی بلکہ حسن و دلکشی اور جمال و زیبائی کی بھی شہزادی تھی جو سیرت و اطوار، اخلاق و عادات، عبادت و ریاضات اور توکل و استغناء میں اپنے باپ کا عکس جمیل تھی۔  
 مصحفِ رُخ کسی کا ہے کہ بیاضِ عافط

ایسے چہرے سے تو بس قال نکالی جائے

بادشاہ کو وہ شہزادی بہت پسند آئی۔ اس کے حیران کن حسن سے وہ بہت متاثر ہوا۔ اس کا دل پہلو میں دھڑکنے لگا۔ بڑی شائستگی اور لجاہت کے ساتھ کہنے لگا۔ چچا حضور! آپ تو اس مشقت پسند زندگی کے عادی ہو گئے ہیں تو اپنے ساتھ انھیں کیوں مشقت پسندی میں گھسیٹے ہوئے ہیں۔ اگر آج آپ خود تشریف نہیں لے چل رہے ہیں تو کم از کم حیحی حضور اور شہزادی عالیہ ہی کو شاہی محل میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں جہاں پر ہر طرح کی آسائشیں ان کی منتظر ہیں۔

کیسی باتیں کرتے ہو بیٹے! جس بات کو میں نے اپنے لئے پسند نہیں کیا اسے اپنے اہل و عیال کے لئے میں کیوں کر پسند کروں گا؟ اور ہمارے بیوی بچے اپنی اس زندگی سے بہت مطمئن ہیں۔

تایا حضور! ہم نے محض ان کے آرام کے خیال سے عرض کیا تھا کوئی دل شکنی مقصود و خواطر نہیں تھی۔

بیٹا! جس بات کو ہم بھول گئے اس کا تذکرہ ہی عبت ہے۔  
 بادشاہ بڑا مضطرب تھا۔ ہر دم وہ سر و قد، سیمیں تن، نازک بدن، غنچہ دہن، آہو چشم، لالہ رخ، خوبصورت ترین پرتقدس سراپا

نگاہوں میں گھومتا رہا ہے

ہر وقت ایک حسین تصویر میں گم ہوں

جلوے کسی کے کیا میری آنکھوں میں بس گئے

حسن کی قوتِ تسخیر تو ایک مسلمہ امر ہے اور جب اس میں معنوی

تقدس کی آمیزش ہو جائے تو وہ بڑا محترم اور پاکیزہ پاکیزہ سا ہو جاتا ہے۔ نوجوان

بادشاہ کی جوان دھڑکنیں اس سرِ پائے ناز کے تصور سے مربوط ہو کر زہ گئیں

اب دن رات اس فرزاں حسن کے جلوے اپنے گرد و پیش بکھرے محسوس

ہوتے

اب تو ہر سمت کھلے ہیں تیری یادوں کے گلاب

دل کے ویرانے میں یہ بات کہاں تھی پہلے

گوہر مقصود کے حصول کے لئے اپنے دلِ بیتاب کے ہاتھوں مجبور ہو کر

بادشاہ نے اپنی والدہ کے ذریعے شاہ شجاع کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا

شاہ شجاع نے بادشاہ کے اس پیغام کو خوبصورتی کے ساتھ ٹالنے کی بڑی

کوشش کی مگر عورت ذات اور وہ بھی حقیقی بھائی کی بیوہ کے سامنے ایک

نہ چل سکی۔ سلطان کی والدہ کے شدید اصرار پر آپ نے اس نازک مسئلے میں

غور و فکر کے لئے تین دن کی مہلت مانگی۔ بادشاہ کی ماں نے کہا بھائی جان

آپ چاہے جتنے دن کی مہلت لیں مگر میں جواب میں ہاں ہی سنا چاہتی

ہوں۔ میں ہر قیمت پر اپنی بیٹی کو شاہی محل میں لے جا کر رہوں گی۔ یہ بہت

دن آپ کے ساتھ مشقت جمیل چکی۔ اپنی فطری و پیدائشی حق کیساتھ

ہی ساتھ اپنی گونا گوں خوبیوں، بے پناہ حسن و جمال اور نسوانی وقار و کمند

کی بدولت اب شاہی محل ہی اس کا صحیح مقام ہے۔ سلطان کی والدہ

کے جانے کے بعد آپ کو بڑی فکر و امنگیں ہوئی کہ وہ اپنی عابدہ، زاہدہ، صابره اور انتہائی نیک و سعادت مند بیٹی کے لیے کیا کریں۔ جو چیز انھیں خود پسند نہیں تھی وہ اپنی اولاد کے لیے کیونکر پسند ہو سکتی تھی۔ جس بستی میں آپ کا قیام تھا وہیں ایک چھوٹی سی مسجد بھی آپ نے بنا رکھی تھی جس میں آس پاس کے لوگ اگر نماز پڑھتے تھے۔ انھیں میں ایک غریب خدامت پر سبز کارنوجوان بھی تھا اپنے اخلاق و عادات اور حسن عمل کی بناء پر وہ آپ کو اچھا لگتا تھا۔ نماز میں خشوع و خضوع اور طویل سجدوں کی وجہ سے وہ آپ کی نگاہوں میں محترم تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد دل میں ایک حتمی فیصلہ کر کے اٹھے۔ سب سے پہلے مسجد میں گئے۔ حسن اتفاق وہی نوجوان جو تھوڑی دیر پہلے آپ کا مرکز تصور تھا۔ معبود حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز نظر آیا۔ آپ جا کر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ کافی دیر کے بعد اس نے نماز ختم کی۔ اس نے بڑھ کر سلام کیا۔ سلام و دعا کے بعد خیریت دریافت کی اور گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ اثنائے گفتگو آپ نے اس سے دریافت فرمایا "صاحبزادے! کیا تم شادی شدہ ہو؟" نوجوان نے ادب کیساتھ جواب دیا۔ "نہیں۔"

"شادی کرنا پسند کرو گے؟"

"میں ایک مفلوک الحال اور بے حد غریب ہوں۔ ایسے کنگال

آدمی کو کون اپنی بیٹی دینا پسند کرے گا؟"

نوجوان! اگر پسند کرو تو میں اپنی بیٹی دینے کے لئے تیار ہوں۔"

تیمیز خیز مسرت کے عالم میں رزتے ہوئے نوجوان نے عرض کیا: حضور والا!

یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ کہاں آپ اور کہاں میں؟ مجھے اچھی طرح سے

معلوم ہے کہ آپ ہی اس ملک کے حقیقی فرماں روا ہیں۔ اور آج بھی شاہی

سواری آپ کے دولت کدے پر آئے دن اترتی رہتی ہے۔ آخر ایک شہزادی اور ایک بے نوافقیر کا کیا جوڑا؛ چہ نسبت خاک را با عالم پاک؛ مغل میں ٹاٹ کا پیوند؛ بھلا یہ شادی بھی کہیں کامیاب ہو سکتی ہے؛ اور پھر ایک شہزادی کب ایک کنگال کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر سکتی ہے۔

نوجوان! جو تم کہہ رہے ہو وہ بھی اپنی جگہ پر درست ہے۔ مگر وہ میری بیٹی ہے۔ اس کی سعادت سے مجھے امید ہے کہ وہ میرا فیصلہ بڑی خوشی کے ساتھ قبول کرے گی۔ پھر اگر تم تیار ہو تو اس سلسلے میں کوئی قدم آگے بڑھاؤں۔ شریعت کی رو سے آخری فیصلہ تو اسے ہی کرنا ہے۔

آپ کی غلامی میرے لئے بڑی سعادت ہوگی۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ میرے غربت کدے کا ماحول شہزادی کا طبع نازک برداشت نہ کر سکا تو جگ ہنسائی جو ہوگی سو ہوگی ہی میرا فقر و فاقہ الگ رسوا ہوگا اور سہراہ میری غربت نشان تضحیک بنے گی۔

غموں کی دھوپ میں کاٹا ہے زندگی کا سفر

کوئی شجر میرے رستے میں سایہ دار نہ تھا

نوجوان! تو بجا اندیشے سے اپنے آپ کو ہلکان مت کر۔ ایک بار جب میں نے کہہ دیا کہ وہ میری بیٹی ہے اور اسے تجھ سے زیادہ میں جانتا ہوں تو غاظر جمع رکھ اور اپنے رب پر بھروسہ رکھ وہ جو بھی کرے گا بہتر ہی ہوگا یہ بتا کہ تیرے پاس کچھ رقم ہے؟

”جی ہاں! صرف تین درہم“

”کافی ہے۔ ایک درہم کی روٹی، ایک درہم کا سالن، اور ایک درہم کا خوشبو خرید لینا“ مسجد سے واپس آ کر اپنے اپنی بیوی سے

اس نوجوان کا ذکر کیا اور فرمایا میں چاہتا ہوں کہ اس تین دن کے اندر اندر اپنی بیٹی کا نکاح اس نوجوان سے کر کے نصرت کر دوں۔ میں بادشاہ کا رشتہ کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا۔ میں بادشاہت کو میں نے لات مار دی اس کو اپنی اولاد کے لئے کیونکر پسند کر سکتا ہوں۔ تمہاری اس بابت کیا رائے ہے؟ پیکر وفا اور نیک بخت بیوی نے جواب دیا ”بیٹی کے حق میں آپ جو فیصلہ کریں گے وہ ہر حال میں بہتر و صائب ہو گا۔ مگر ایک زبان بیٹی سے بھی دریافت فرمائیں اور ایسی صورت میں یہ اجازت اور بھی ضروری ہو جاتی ہے جبکہ اس کے کان میں شاہی رشتے کی بھنگ پڑ چکی ہے۔“

ہاں ہاں! اس سے پوچھنا تو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اسلام نے بالغ لڑکی کو اتنا اختیار تو دیا ہی ہے کہ والدین یا اولیاء اگر زبردستی اس پر اپنا فیصلہ دل پسند مسلط کرنا چاہیں تو اسے وہ مسترد کر سکتی ہے اس نازک اور اہم ترین مسئلے میں خود دو ٹوک اس سے بات کرنا پسند کروں گا۔

ہاؤ تم کسی بہانے سے میرے پاس بھیجو۔

”ابا حضور! آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے؟“

”ہاں بیٹی! بیٹھ جاؤ۔ ایک نازک مسئلے میں تمہارا مشورہ بہت ضروری ہو گیا ہے میں نے براہ راست تم سے گفتگو کرنا مناسب سمجھا۔ بیٹی! بات دراصل یہ ہے کہ مجھ سے تعالے تم اب عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکی ہو جہاں پہنچ کر والدین کو اپنی بیٹی کے لئے بہتر مستقبل کی فکر ہونے لگتی ہے اور والدین کو نکاح کے پیغام ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ میں تمہاری طرف سے غافل نہیں تھا بلکہ اپنے حسب حال کسی مناسب راستے کا منتظر تھا کہ بے شان و گمان بادشاہ کی والدہ تمہارے لئے سلطان کا پیغام لے کر آئیں جس کا

کسی حد تک تم کو بھی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ میں ذاتی طور پر اس رشتے کے حق میں نہیں۔ میں نے خوبصورتی کے ساتھ اس رشتے سے بچنے کی بڑی کوششیں کیں لیکن سلطان کی والدہ نے اپنی قرابت داری اور خون کی دہائیاں کچھ اس انداز سے دینے لگیں کہ صاف لفظوں میں انکار کرتے نہیں بنا۔ اور وہ پھر اپنی بات کے علاوہ دوسرے کی کچھ سُننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ وہ ہر حال میں تمہیں اپنی بہو کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے غور و فکر کے لیے تین دن کا وقت لیا ہے کہ ان تین دنوں میں سوچ کر جواب دوں گا۔ انہوں نے چلتے چلتے بار بار اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ آپ چاہے جتنے دن کا موقع لیں فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہئے۔ میں اپنی بیٹی یعنی تمہیں ہر حال میں شاہی محل میں لے جا کر رہوں گی۔ بیٹی! شاہی محل اور بادشاہی ایک خواب ہے عوام کے لئے۔ لیکن کوئی مجھ سے پوچھے میں اسے جمیل چکا ہوں وہ روح کے لیے ایک مستقل آزاد ہے۔ میں ایک صالح متقی اور متوکل مگر بہت غریب نوجوان کو جانتا ہوں۔ وہ نوجوان تقویٰ اور پرہیزگاری اور عبادت گزار کی کے باعث مجھے پسند ہے۔ تم بادشاہ اور اس غریب مگر پرہیزگار نوجوان میں سے جسے پسند کرنا سے اپنے فیصلے سے مجھے جلد آگاہ کرو۔ انہیں تین دنوں میں مجھے تمہارے متعلق کوئی بڑا اور حتمی فیصلہ کر ڈالنا ہے۔“

شہزادی اپنی شادی کے ذکر پر شرم و ندامت سے سرخ ہو گئی  
 روکی کی شرم ہی تو اس کا اصل حُسن ہے سے

کتنے رنگین تصویر کی حنا بندی ہے

بوئے گل، لالہ دل، دونوں تین سے گزے

شہزادی بڑے قرینے سے اٹک اٹک اور جھجک جھجک کر کہنے لگی ابا حضور!



جو آپ کو پسند نہیں تو کیا آپ کو یہ امید ہے کہ آپ کی بیٹی اسے پسند کرے گی۔ جو چیز آپ کی روح کا آزار ہے وہ رُوح کی بہاروں کا موسم کیسے بن سکتا ہے؟  
آپ کی پسند ہی میرا سرمایہ حیات ہے۔“

اہل وفا کے باغ سے پھوٹی نہیں اگر

خوشبو کہاں سے آئی یہ شاخ گلاب میں

سُبْحَانَ اللّٰہِ! جِزَاکَ اللّٰہِ! تمہاری سعادت مندی سے مجھے ہی

امید تھی کہ خدا کے پاک و بے نیاز تمہیں دارین کی خوشیاں میسر فرمائے۔  
شہزادی خاموشی سے اٹھ کر باپ کے پاس سے چلی گئی۔

دوسرے دن محلہ کے معززین کے سامنے شاہ شجاع نے اپنی خوبرو

اور سعادت مند بیٹی کا نکاح اس غریب نوجوان سے کر دیا۔ نکاح کے بعد

بیٹی کو دولہا کے ساتھ اسی رات رخصت بھی کر دیا۔ خاموش مسرتوں کے

ہجوم میں شہزادی نے جملہ عروسوں میں قدم رکھا۔ آرزوئے شوق کی گھا

گھی میں اپنے تنگ دامن میں دونوں بہان کی خوشیاں سمیٹنے دُنیا کا

خوش نصیب ترین دولہا بھی ساتھ میں تھا۔ دوہن شہزادی نے

ایک شان استغناء سے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ کمرے کی حالت دولہا

کے غربت و بے سرو سامانی کی تصویر تھی۔ اس فلاکت زدہ کمرے میں جوں

جوں شہزادی کی نظر ادھر سے ادھر ہوتی۔ غریب دولہا کے دل کی

دھڑکنیں بڑھتی جاتی تھیں، اور چہرے پر اپنی کم مائیگی اور بے سرو سامانی

کا احساس نمایاں ہو جاتا۔ اپنی حیثیت اور شہزادی کی عظمت پر ہر اس سال

اور اس کے حسن فروزاں سے مبہوت صورت حال کی نزاکت نے اس کے

دل کی دُنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

اب تو آنکھوں کی سیج پر ہمد  
سارے منظر ترے وصال کے ہیں  
بالآخر شہزادی کے نظروں کی گردش کمرے کے ایک گوشے میں رکھے  
ہوئے پانی کے ایک برتن پر ٹھہر گئی۔ ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ جنبش  
لب نغمہ بار ہوا۔

” وہ کیا ہے ؟ “

” پانی کا گھڑا جس کے اندر پانی بھرا ہوا ہے۔

” گھڑے پر کیا ہے ؟ “

” ایک روٹی کا آدھا ٹکڑا۔ نصف کھالیا ہوں اور نصف کھل کے لئے بچا  
لیا ہوں۔ یہی میری کُل پونجی ہے۔

یہ سن کر شہزادی کے بے حد حسین چہرے پر گردِ ملال ظاہر ہوا۔ طبع نازک  
کبیدہ خاطر ہوا۔ چمن کی ہر کلی بو شرمیلنے والی جاں نواز تبسم شرر بار ہوا۔ ایک  
جھٹکے کے ساتھ دو لہا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ” مجھے ابھی میرے باہری  
خان کے گھر واپس پہنچا دیجئے “ یہ آواز کیا تھی۔ اس کے آرزوؤں  
کے حسین محل میں ایک دھماکہ تھا۔ تمناؤں کی بارات تو ابھی سچ ہی رہی  
تھی۔ اُننگیں و لو لے شاد کام حسرتوں میں تبدیل ہونا ہی چاہتے تھے کہ  
اچانک یہ کیا ہو گیا ؟

نوجوان خواہ اس باختگی کے عالم میں بڑے درد کے ساتھ لرزتی آواز میں  
عرض کناں ہوا ” قابل احترام شہزادی یہ کیا سن رہا ہوں ؟ یہ بیداری  
ہے یا خواب ؟ “ آپ جو کچھ سن رہے ہیں بیداری کے عالم ہی میں  
ہیں اور صبح سن رہے ہیں ایک بار پھر سن لیجئے کہ مجھے اپنے باپ کے گھر

ابھی واپس پہنچا دیجئے۔ میں ہر حال میں آج ہی اپنے والد گرامی تک پہنچنا چاہتی ہوں۔“

نوجوان درویش نے بڑے کرب کے ساتھ کہا: شہزادی عالیہ! اتنی بڑی اور کڑی سزا ہمیں کس جرم کی پاداش میں دے رہی ہیں آپ؟  
خدا شاہد ہے کہ میں نے آپ کے یا آپ کے والد کے ساتھ کوئی دھوکہ کوئی فراڈ نہیں کیا۔ ان پر اپنی غربت و بے سروسامانی نہیں چھپاتی۔ حد یہ ہے کہ میں تو سے آپ کے تصور کا مجرم بھی نہیں۔ رشتہ طے ہونے سے پہلے بار بار میں نے اپنی غربت و افلاس کا حوالہ دیا۔ اس بے جوڑ شادی کے انجام کو بھی ان کے سامنے رکھا کہ کہاں میری فلاکت زدگی اور کہاں ایک بے مثال شہزادی؟  
میرے غربت گدے کا ماحول شہزادی کا طبع نازک نہیں برداشت کر سکے گا مگر وہ نہیں مانے۔ آپ کی سعادت مندی اور استغناء کا خطبہ پڑھتے رہے کہ وہ ہر حال میں راضی بہ رضا رہنے والی لڑکی ہے۔ تم مطلق اندیشہ نہ کرو۔  
انہیں مسلسل یقین دہانیوں پر میں نے اتنی بڑی حماقت کی جرأت کی تھی۔ کاش! مجھ سے اتنی بڑی غلطی سرزد نہ ہوتی۔ محل میں ٹاٹ کے پیوند کا یہی جشر ہوتا ہے۔ آپ کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ آپ اپنے والد ماجد کے کئے ہوئے کی سزا اس غریب و ناتواں کو نہ دیں۔ آج ہی میری شادی ہوئی ہے۔ آج ہی آپ نے دو لہن بن کر میرے غربت گدے میں قدم رنجہ نہ کرنا کہ مجھے ایک آفاقی خوشبو سے آشنا کیا ہے۔ یہ ہماری یسۃ الزفاف اسہاگ رات، ہے سے

یہ قرب کے لمحات اگر بھول بھی جاؤں  
برسوں مجھے تڑپائے گی احساس کی خوشبو

اگر آج ہی آپ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو یہ شادی زندگی بھر کے لئے  
 ایک سزا بن جائے گی۔ سردار میری محرومیوں کا مذاق اڑایا جائے گا۔ میرا فقر و  
 فاقہ رسوا ہوگا۔ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں۔ میری عرضداشت پر غور فرمائیں  
 مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ آپ حسن صورت و سیرت دونوں میں منفرد اور عام  
 سطح سے بالاتر ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے شاہی رشتے کو مسترد  
 فرمادیا ہے۔ میں اپنے نصیب کی ازجندی پر فرحان اور اپنی فیروز بختی پر نازاں  
 تھا کہ مجھ بے نوا کو ایک بادشاہ پر ترجیح دیا گیا۔ آہ! مجھے کیا معلوم تھا کہ  
 تصورات کے یہ حسین محل آن واحد میں زمین بوس ہو جائیں گے۔ جاگتی  
 آنکھوں سے جو خواب دیکھا تھا وہ سب محض ہوگا۔ ہٹے کس درد کے  
 صحرا میں تنہا بھٹکنے کے لئے مجھے چھوڑ رہی ہیں آپ سے

یاس کی نیند سلانا اگر تھا، ہی منظور  
 میری امید کی زاتوں کو جگایا کیوں تھا

”میرے سرتاج! آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آپ کو ہمیشہ کے  
 لئے چھوڑ کر نہیں جا رہی ہوں۔ میرا مستقبل آپ کے ساتھ تو میری ہی مرضی سے  
 وابستہ ہوا ہے۔ میرا مزاج جینا اب آپ ہی کے ساتھ ہوگا۔ میں سزا و سزا اپنے  
 عظیم باپ سے یہ پوچھنے جا رہی ہوں کہ آپ نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ تمہارا  
 نکاح ایک متقی پرہیزگار اور متوکل مگر غریب و نادار نوجوان سے کرنا چاہتا ہوں  
 اسی بنیاد پر میں نے بادشاہ کے پیغام کو مسترد کر دیا تھا۔ والد گرامی سے  
 یہ پوچھنا ہے کہ رشتے کی منظوری لیتے وقت آپ نے غلط بیانی سے  
 کیوں کام لیا۔ آپ کو بادشاہ کے بجائے یہی نوجوان پسند تھا تو آپ  
 ہمیں صرف حکم دیتے۔ تقویٰ اور توکل کا فریب کیوں دیا؟ جس شخص کو

رزاق مطلق پر اتنا بھی بھروسہ نہیں کہ جس نے اپنے فضل سے رزق عطا فرمایا، وہی کل بھی دے گا جو ادھی روٹی آج کھاتا ہے اور ادھی کل کے لئے بچا رکھتا ہے کہ پتہ نہیں کل روزی ملتی بھی ہے کہ نہیں؟ وہ صاحب تقویٰ تو کل کیوں؟ جسے اتنا بھی بھروسہ نہیں کہ وہ رزاق کل بھی روزی دے گا اسکے متعلق یہ کیسے یقین کر لیا گیا کہ وہ پرہیزگار متوکل اور خدا رسیدہ ہے؟ افسوس تو اس بات پر کہ جسکی وجہ سے شاہی رشتہ ٹھکرا یا وہ یہاں سر سے ناپید ہے۔ میں اپنے باپ کے دامن کو پکڑ کر جھجھوروں گی کہ اپنے مجھے ایک ایسے شخص سے کیوں بیاہ دیا جسکے پاس تو کل استغناء اور پرہیزگاری نام کی کوئی چیز نہیں۔

شہزادی کے جوابے نوجوان درویش سناٹے میں آ گیا۔ شرم و ندامت کا ڈوبی آواز میں تجز و درماندگی کیساتھ عرض گزار ہوا: "عظیم باپ کی غلطی آپ کے متعلق میں اوجھے انداز فکر پر بہت نادم اور سناٹا ہی معافی کا تو استکار ہوں۔ تقویٰ و پرہیزگاری تو کل و استغناء کے جس مفہوم سے اپنے مجھے آشنا کیا ہے بیشک یہ شاہ شجاع کی شہزادی ہی کا حصہ ہے اور ان کی تربیت خواص کا طرہ امتیاز! یہ روٹی اتنا بڑا فتنہ ثابت ہو گئے مجھے نہیں معلوم تھا اور ایک طرح اچھا ہی ہوا کہ اسی کی بدولت تقویٰ و توکل کے ایک نئے بہترین روپے روشناس ہوا۔ یہ بیکر ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خالی ہاتھ واپس آیا کہ میں نے اسے ایک فقیر کو خیرات کر دیا ہے میں آپ کا بچہ ممنون کر رہا ہوں کہ آج اپنے مجھے توکل کی اصل حقیقت سے آشنا کیا۔ شہزادی نے سکون کا سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک دن تو ازبسم کے ساتھ نئے سب سے اپنے شوہر کی طرف نعت پاؤ اش نظروں سے دیکھا ہے

بسم اور پھر ان کے لبوں کا بزم چمن کی ہر کی شرمادری ہے

# مہر کا پند

ہندوستان کا قدیم مذہبی شہر مہر امرلی والے کرشن جی کے  
مقام پیدائش ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کا مرکز عقیدت تھا۔ مہر کی تاریخی  
حیثیت جو بھی رہی ہو مگر کرشن جی اور ان کی گویوں نے اپنی مذہبی حیثیت  
سے شہرت دینے میں نمایاں رول ادا کیا اور آج بھی ہندوؤں کی نظریں  
اس کا افسانوی تقدس برقرار ہے۔

کرشن مراری کے اسی شہر میں ایک انسان ہفتوں سے بھٹکتا  
پھر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے متاعِ گمشدہ کی تلاش ہے۔ سیا کرتا، چہرے  
پر گھنی داڑھی جس کے آگے سے زیادہ بال سفید ہو چکے ہیں، اسکی متوحش اور  
تجسس نگاہیں صبح سے شام تک بلند مقامات اور ان کے دروبام پر  
پھلتی رہتیں اور کبھی کبھی بے چینی کے عالم میں آہ سرد کیساتھ پر درد آواز  
میں یہ پڑھتا نظر آتا ہے

عالم خراب حسن قیامت نشان کیست

دردہ کدام فتنہ گراست وزمان کیست

خوش نصیب! موسم بہار کی ایک صبح اپنے دامن میں مسترتوں

کے ترانے سمیٹے طلوع ہوئی۔ چند زہرہ جبینوں کا ایک جتھا خرام ناز سے چلتا  
ہوا شہر سے چلنا ہوا شہر سے باہر نکلا۔

بڑے ناز، بڑے انداز، بڑے تکنت کے ساتھ! درباری کا ماتر بانگین لئے ہوئے  
 قدم قدم پر محشر پنا کے ہوئے۔ لگتا ایسا تھا کہ گوسپاں اپنے روٹھے ہوئے  
 کیشن کو منانے کے لئے ناز و ادا کے اسلحے سے مسلح ہو کر نکلی ہیں۔

اگر دو شیراؤں کی اس گروہ میں "لاجوتی" کی حیثیت سب سے

نمایاں تھی۔ قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ اسے حسن کی دولت سے نوازا

تھا۔ سر و قد، لمبی سیاہ زلفیں، ساون کی اٹھتی ہوئی گھاؤں کی طرح،

نوبصورت پتلے پتلے ہونٹ، شہابی چہرہ، مسکراتی آنکھیں، گھنے ابرو،

جب کھکھلا کے منستی تو اسکے چہرے پر شفق کے رنگین لہرے پھوٹ پڑتے اور

جب وہ ایک ادلے ناز سے اپنے آنچل درست کرتی تو حیات کی دھڑکنیں

رکتی ہوئی محسوس ہوتیں اور جانے کتنے بوڑھے جوان سسکیاں لینے

لگتے غرور حسن نے کنیاؤں کو اپنے ماسوا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ آگے پیچھے

دیکھ کر چلنا بھی انھوں نے اپنی بے نیازیوں کی توہین سمجھا۔ باہم اٹھکھیلیاں

کرتیں، شاخ گل کی طرح لچکتی چکتی سمٹی چلی جا رہی تھیں کہ اچانک سہراہ

متھرا کی گلیوں میں وہی ہفتوں بھٹکنے والا اجنبی مسافر آ گیا اور بڑی حسرت

و امید کے عالم میں "لاجوتی" کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا

خوشا رسوائی و حالے تباہے

سہراہ ہے و آپے یک نگاہے

معلوم نہیں اور لڑکیوں نے اس شعر کا مطلب سمجھایا نہیں مگر

"لاجوتی" تڑپ اٹھی۔ بھوکے شیرنی کی طرح دھاڑتی ہوئی بونی! بڑے میاں

تمھیں شرم آتی چاہئے کم از کم اپنے چہرے پر اس سفید داڑھی کا تو کچھ خیال

کرو بیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔ یہ متھرا ہے متھرا۔ جھنجھان

نہیں۔ چلو اپنا راستہ لو۔ اور پھر خبردار اپنا یہ منحوس تھوڑا امت دکھانا۔ اس طرح گرجتی برستی وہ اپنے سہیلیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گئی۔ اس کی سکھیاں سہیلیاں حیران پریشان کبھی اس اجنبی کو دیکھتیں اور کبھی غیظ و غضب میں بھری ہونی خود بصورت لاجوتی کو جس کے پہرے پر غصے نے اور دلاویزی پیدا کر دی تھی۔

بالآخر ایک نے چلتے چلتے ہمت کر کے پوچھ لیا: اے راجہ اندر کے سنگھاسن کی پری! آخر اس غریب نے کیا کہہ دیا جو تم اس قدر آپے سے باہر ہو گئیں۔ اس نے تو صرف ایک کو تیار ٹھاٹھا اور وہ بھی اپنی زبان میں جو ہم لوگوں کے پلے تو کچھ بھی نہیں پڑا۔ ہاں اگر تم نے کچھ سمجھا ہو تو بتاؤ تاکہ پھر کبھی ملے تو اس کی ٹھکانے سے خبر لی جائے۔

جیسے تم لوگوں نے کچھ نہیں سمجھا ایسے ہی میں نے بھی کچھ نہیں سمجھا لاجوتی نے بہت کچھ چھپائے ہوئے جواب دیا۔

پھر اسے دیکھتے اور اس کے منہ سے کویتا سنتے ہی کیوں آپے سے باہر ہو گئیں اور اس غریب پر اس طرح ٹوٹیں کہ وہ تھوڑی دیر میں جانے کتنی بار مڑ کے گیا۔ ویسے اگر تمہیں اپنی سندرتا کی طاقت کو آزمانا ہی تھا تو صرف مسکرا کے اس کی غیریت ہی پوچھ لیتیں وہ یوں ہی قتل ہو جانا۔

گائتری جی اتم تو لگیں مذاق اڑانے۔ حالانکہ بھگوان نے تمہیں خود اتنی سندرتا دی ہے کہ اگر بہادر سے بہادر جوان کی طرف ایک غلط نگاہ ڈال دو تو وہ اپنا دل پکڑ کر تڑپنے لگے اور چیخ چیخ کر تمہاری بے نیازی کا ماتم کر کے کہے یوں ترپھی نگاہوں سے مجھے قتل بھی کرنا پھر صاف مگر جانا کہ میں اس سے بری ہوں



سبح جانو سکھی جانے کیوں ان موئے ترکوں کو دیکھ کر میرے تن بدن  
میں آگ لگ جاتی ہے۔

ارے واہ! یہ کوئی بات ہوئی؟ ہمارے اسی شہر میں نہ جانے  
کتنے ترک بستے ہیں اور وہ روزانہ بہتیرے آتے جاتے رہتے ہیں ان لوگوں  
کو دیکھ کر تو ہم لوگوں کے تن بدن میں بالکل آگ نہیں لگتی۔ شاید میری رانی  
اتھاس (تاریخ) زیادہ پڑتی ہے اور اس کی آنکھوں میں ہر ترک کے چہرے  
پر غزنی کے اس بچھ انسان کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے جس نے تمہارا کو بوٹے  
وقت اس کی پوترتا کا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔

لو تم تمہارا کو رو رہی ہو۔ وہ تو تھا نیسرا اور سومنا تھ جیسی شہتی  
والی تیر تھ گا ہوں کو بیدردی کے ساتھ روندتے ہوئے ہمارے بڑے بڑے  
دیوتاؤں کے قبر سے نہیں ڈرا۔ اپنے سترہ حملوں میں سارے ہندوستان کو  
اکھاڑ پکھاڑ کر رکھ دیا۔ مگر یہاں کے سیکڑوں راجہ اپنی بھاری سینا کے  
باوجود اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے اور وہ آندا سانڈ کی طرح اکھنڈ بھارت میں  
دندنا تاربا۔ آج اپنی اتھاس پڑھتے وقت اپنے بڑے بڑے راجوں ہمارا  
اور سینا پتیوں کی کا پرتا پر ہمیں بھی شرم آتی ہے۔ اس طرح وہ باہم الجھتی  
ہوئیں اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئیں۔

ایک دن صبح ہی صبح روپوتی «لابوتی» کے ماسی کے گھر پہنچ گئی۔  
ماسی کو نمستے کرنے کے بعد وہ سیدھے لابوتی کے کمرے میں پہنچی۔

ارے دیوی جی! ابھی آپ کا سونا ہی ختم نہیں ہوا؟  
اوپ او۔ ابھی ابھی میں تمہیں یاد کر رہی تھی۔ بہت دن تک جیوگی  
ہاں آج بہت دیر تک جا گئی لہی اسی لئے سویرے اٹھ نہ سکی۔

دھنیا باد! میں یاد تو آئی۔

یہ میرے جذبے کی سچائی ہی تو ہے کہ میں نے سچے دل سے تمہیں یاد  
کیا اور تم کھنچی ہوئی چلی آئیں سے

ہم نے ان کو تو پکارا ہے مگر اے جذبہ دل  
ان پر بن آئے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

لیکن یہ تم نے مانجھے میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرح ایک دم سے باہر نکلنا  
کیوں چھوڑ دیا؟

ہاں آج کل میں باہر کم ہی نکلا کرتی ہوں۔

کیوں؟ کیا اسی کو تیا پڑھنے والے ترک کے ڈر سے۔ ارے وہ تو بڑا

کا پر نکلا۔ تمہارے ایک ہی جھاڑ سے وہ متھرا سے ایسا غائب ہوا جیسے گدھے

کے سر سے سینگ! لیکن میں یہ نہیں مان سکتی کہ اس دن کے کویتا کا مطلب

تم نہیں جانتی ہو۔ عورتوں کی چھٹی جس اگر کوئی چیز ہے تو میں یہ یقین سے کہہ سکتی

ہوں کہ اس دن کے کویتا اور تمہارے درمیان ضرور کوئی بھید ہے۔ اسے دیکھتے

ہی تمہارا ٹمپر پچر چڑھ جانا اور تمہیں دیکھ کر اس کے آنکھوں کی مخصوص چمک اور

پھر غصے میں تمہارا یہ کہنا کہ یہ متھرا ہے متھرا۔ جھنجھان نہیں۔ اپنے پیچھے کوئی کہانی

لئے ہوئے ہے۔ لاہو! میری جان کیا تم اس کویتا کے پیچھے پیچھے ہوئے بھید

پر وہ اٹھا سکتی ہو؟ میں اسی دن تم سے پوچھ بیٹھی مگر سہیلیوں کے نجوم

میں اسے مناسب نہیں سمجھا۔ آج اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر ڈالو۔ عورتوں کے

متعلق مشہور ہے کہ وہ پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں مگر تم اپنی روپا کو اس کا اسٹا

پاؤگی۔ اچھا بس شروع ہو جاؤ۔

روپ! تم جانتی ہو کہ میں نے آج تک تم سے کوئی بات نہیں چھپائی اور

چھپا بھی نہیں سکتی۔ تم متھرا میں میری سب سے پیاری سہیلی اور میری ہمراز ہو۔ میں کئی دن سے خود تم سے ملنے کے لیے سوچ رہی ہوں۔ اچھا ہوا کہ تم خود ہی آگئیں۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی لیکن روپ! تم یہ بات اپنے ہی تک محدود رکھنا۔ یہ بات صرف ماسی کو معلوم ہے کہ میں یہاں اپنا گھر چھوڑ کر کیوں پڑی ہوں تمہیں کزیشن بھگوان اور ان کی گوپیوں کی اٹوٹ محبت کی قسم جو یہ بات تم سے آگے بڑھے۔

ارے بنگلی! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟

اچھا تو سنو! اس دن اس ترک کے کوتیا اور اس کے پڑھنے کے مقصد کو میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی اور اسی لئے میں اس پر بڑی طرح بھڑک اٹھی تھی۔ اچھا تمہیں بتاؤ کہ اس میں اور مجھ میں کتنا فرق ہے۔ میں ایک ہندو کنیا اور کہاں وہ مسلمان؟ بیس سال کی میں کنواری اور کہاں چالیس کے اوپر کا وہ مسند؟ کسی طرح کی کوئی بھی تو نسبت نہیں۔ اور بڑے میاں چلے ہیں مجھ جیسی بندو لڑکی پر عاشق ہونے۔

کیا کہا؟ وہ نوا ترک تم پر عاشق ہے؟

ہاں روپ! اور عاشق بھی ایسا ویسا نہیں مجنون، فریاد، رانجھا، ان سب کا نام تم نے ضرور سنا ہوگا۔ مگر ہمارے بڑے میاں کی شان سے زالی ہے۔ بڑے میاں مسلمانوں کے معزز پیشوا تھے سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو ان سے گیان دھیان ملا۔ یہ خود بھی بال بچے دار آدمی ہیں۔ عربی فارسی اردو کے بہت بڑے جانکار ہیں۔ سیکڑوں لوگ ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ ایک بار کہیں انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔ بس اسی دن سے دیوانے ہو گئے۔ مسجد مدرسہ گیان دھیان پر ارتھناست کھ چھوڑ چھا

بس میرے پیچھے پڑ گئے یہاں تک کہ میرا گھر سے نکلنا دو بھڑ ہو گیا۔ میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے رات دن میری گلی کے چکر لگاتے رہتے۔ اور اکثر دھڑنا دیئے پڑے رہتے۔ دنیا کی تھوک فضیلت، لعنت ملامت کسی کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ آزاد اور کھلنڈرے لوگوں کے لئے بڑے میاں اور میری ذات ایک دلچسپ کھلونا بن کر رہ گئی۔ مجھے بدنامی سے بچانے کے لیے میرے گھر والوں نے کرشن بھگوان کے اس پوتر شہر متھرا میں مجھے اپنی ماسی کے یہاں سارا کچا چھٹا بنا کر بھیج دیا۔

میرے یہاں آجانے پر میرے گھر والوں نے سکون کا گہرا احساس لیا۔ اور میں بھی خوش ہو گئی کہ چلو میری عزت بچ گئی۔ رسوائی جگ ہنسائی سے بھگوان نے بچا لیا۔ مگر میرے خوشی کے یہ دن بہت تھوڑے ثابت ہوئے۔ بڑے میاں یہاں بھی آدھکے اور اسی دن سے میرا سکون غارت ہو گیا۔ اب رات بھر مجھے نیند نہیں آتی۔ ماسی کو بھی اس دن کے بھاؤنا کی خبر نہیں دی۔ اب تم ہی کوئی اُپاے بتاؤ نہیں تو متھرا میں بھی میرا رہنا کٹھن ہو جائے گا۔ رام رام! یہ تو کون بہانی معلوم ہوتی ہے۔ سچ سچ تم بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہو بھگوان تم کو اس مصیبت سے بچائے اچھا کیا جو ماسی سے یہ بات نہیں بتائی ورنہ وہ تو اور بیا کل ہو جاتیں۔ تم کوئی چنتا نہ کرو یہ متھرا ہے اگر بڑے میاں سیدھی طرح راہ پر آگئے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے لئے ضرور کوئی اُپاے کیا جائے گا۔ میں ہر طرح سے تمھارے ساتھ ہوں۔ ویسے میں برابر نکلتی ہوں مگر وہ ترک مجھے پھر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ شاید تمھاری اس دن کی پٹھکانے اس کے سر سے عشق کا بھوت اتار دیا ہے۔ بھگوان کرے کہ ایسا ہی ہو ورنہ میری زندگی ترک ہو جائے گی کوئی

اچھا خاندان مجھے ہو بنانے پر تیار نہ ہو گا۔ لوگ مجھے ایک ویشیا کی طرح سمجھے نگیں گے اور جیتے جی مجھے جو انی کی چٹا پر خود کو بھینٹ پڑھانا پڑے گا۔ بھینٹ پڑھیں تمہارے دشمن تم بالکل چنتا نہ کرنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دن ہفتوں اور مہینوں میں تبدیل ہوتا رہا۔ "لا جوتی" کے لئے یہ واقعہ ایک بھولی بسری کہانی بن کر رہ گیا۔ البتہ کبھی کبھار جب اسے اپنے گھر کی یاد آتی تو بڑے میاں کا مقدس چہرہ لا جوتی کی یادوں کے دتکے پر دستک دے جاتا اور وہ تھوڑی دیر کے لئے ایک بے نام سی غلشن میں مبتلا ہو کر رہ جاتی۔

آج کئی دنوں کے بعد روپ وتی "لا جوتی" سے ملنے آئی۔ لا جوتی ایک ہفتہ بعد یہاں کا سالانہ میلہ شروع ہو رہا ہے۔ ایک ہفتہ بعد مہترا کی ہر گلی کوچہ دو پہن کی طرح سجادی جائے گی۔ خاص کر بڑا مستدر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہو گا۔ جبکہ مستدر کے لئے پجاری شری گوپال جی بنئے ہیں اس مستدر پر بڑی بہ سار آگئی۔ مہترا کا سالانہ میلہ اس سے پہلے شاید تمہارے نہ دیکھا ہو۔

گئے سال تو میں مہترا ہی تھی۔ لیکن ان دنوں مجھے بخار آ رہا تھا۔ اس بے میلہ کی گھاگھی میں نہ دیکھ سکی۔ ہاں تے پجاری کے بارے میں بھی بہت دن سے سن رہی ہوں۔ کئی بار تو من میں آیا کہ تم کو لے کر چلوں کم سے کم درشن ہی کر لوں مگر سوچ ہی سوچ کر رہ گئی۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ وہ کنواری کنیاؤں کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے اور نہ ہی انہیں اپنا چہرہ چھونے دیتے ہیں۔ معلوم نہیں کہاں لک سچ

اور کہاں تک جھوٹ ہے دن رات دھیان گیان میں لگے رہتے ہیں۔ ہر دم بھگوان کی سیوا بھگوان کی یاد بھگوان کا ذکر پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اور بھگوان کے سوا اب دنیا میں کچھ ہے ہی نہیں شہر والے تو بہت ہی خوش ہیں جس کو دیکھو نئے پجاری کا گیت گا رہا ہے۔ ہر شخص ان کا نام احترام سے لیتا ہے بعض لوگ تو ایسا بھی کہتے ہیں کہ شری گوپال جی بھگوان کے نئے اوتار ہیں ایسے مہا پرش کے ورشن کے لئے اپنا من تو بہت زیادہ بیاکل ہے سٹل ہے کہ اس میلے میں وہ کنواری کنیاؤں کو اپنا چرن پھونے دیں گے۔ لایو! تم تیار رہنا۔ اس سال کا یہ یاد گاڑ میلہ میں تمہیں ضرور دکھلاؤں گی۔

میں تو ابھی سے تیار بیٹھی ہوں۔ بس خوشی کی زیادتی میں تم مجھے بھول نہ جانا۔ مجھے بھٹ بھاڑ پسند نہیں۔ میں مندر اور پجاری جی کا ورشن بٹے شانتی سے کرنا چاہتی ہوں بھاگ بھاگ میں کچھ مزہ نہیں آئے گا۔

آج مٹھرا کی سچ و سچ پورے شباب پر بے بڑے صبر آزما انتظار کے بعد وہ دن آ ہی گیا۔ جو مٹھرا والوں کے لئے خوشیوں مسترتوں اور شادمانیوں کا سیلاب لیز آتا ہے۔ ہر طرف سے آدمیوں کا سیلاب ہے کہ بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ ہر شخص خوش ہے کیا مرد کیا عورت کیا بچے کیا بوڑھے، خاص کر کنواری کنیاؤں کا اضطراب شوق تو بس دیکھنے کی چیز ہے۔ مٹھرا کا سارا مشن آج شری گوپال جی مہاراج کے مندر میں سمٹ کر چلا آیا ہے۔ پانی پڑ چکے کھانی ہون کشتی کی طرح خرام تازے نسیم سحر کی طرح عورتوں کا خوبصورت جھانسیہ بولوں کو بے دردی کے ساتھ پامال کرتا ہوا مندر میں داخل ہونے لگا۔ عورتیں ایک طرف سے مندر میں داخل ہوتیں۔ بھگوان کی مورتی پر بار بھول ڈالتیں اس کے بعد بڑے پجاری کے چرنوں کو چھو کر ان کا آشر واد لیتیں اور دوسرے

راستے سے بکل جاتیں۔ یہ سلسلہ صبح ہی سے چل رہا تھا۔ دن کے تیسرے گھنٹے  
 جب عورتوں کی بھیت ٹختم ہوئی تو سب اخیر میں لا جوئی اپنی پیاری سہیلی  
 روپ وتی کو لیکر مندر میں داخل ہوئی۔ سب سے پہلے اس نے بھگوان کی موتی  
 پر پھول چڑھایا پھر پوجا پاٹ کیا۔ اس کے بعد دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ  
 نئے پجاری شری گوپال جی کی طرف بڑھی۔ پہلے روپ وتی نے چڑیوں کو چھو کر  
 آشرود لیا۔ وہ پجاری کی شخصیت سے بہت مرعوب دکھائی دے رہی تھی۔  
 لا جوئی جوں ہی پجاری کے قدموں کی طرف بڑھی ایک جھٹکے کے ساتھ  
 پجاری نے پاؤں سمیٹ لئے۔ اور اس کا ماتھ ہٹاتے ہوئے کہا: نہیں نہیں!!  
 تم ہمارا پاؤں چومنے کے لئے نہیں پیدا کی گئی ہو بلکہ میرے دل کے  
 سنگ اپن پر حکومت کرنے کے لئے۔ یہ سن کر لا جوئی ہتکا بکا رہ گئی اور  
 عالم حیرت میں اس کی آنکھیں کھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بڑے خور سے پجاری  
 کی طرف دیکھنے لگی۔ پجاری نے مسکراتے ہوئے پر شفقت لہجے میں کہا پچانے  
 کی کوشش کر رہی ہو اتنا سننے ہی اس کے ذہن میں جھماکہ ہوا۔ یادوں کے  
 درپے کھلتے گئے جسم کی تمام حسیات اس کی آنکھوں میں آگئیں تصور میں ماتھ  
 پر قشقے کی جگہ سجدے کا نشان اور ڈارٹھی سے بے نیاز چہرے پر خوبصورت  
 و پروقار ڈارٹھی سے بھرا ہوا وہ چہرہ نظر آنے لگا جو بہت دنوں پہلے سہراہ  
 یہ کو تیا بڑھتا ہوا نظر آیا تھا۔

خوشا رسوائی و حالے تباہے

سہراہے و آہے یکا بگاہے

اس کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا آ آپ! اس کا دہن دھوا

دھواں ہو رہا تھا۔ سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی کہ مسلمانوں کا مذہب ہی

پیشوا اتنے بڑے مندر کا پجاری کیونکر ہو سکا؟ اس سے زیادہ وہ کچھ سوچ نہ سکی  
 اس کا ذہن تاریک ہوتا چلا گیا اور وہیں غش کھا کر گر پڑی۔ روپ و تی اور پجاری  
 دونوں نے اُسے لپک کر سنبھالا۔ منہ پر پانی کے پھینٹے مارے۔ تھوڑی دیر  
 بعد اُسے ہوش آیا ابھی اسکی ہیرت کا طسم ٹوٹنے بھی نہیں پایا تھا کہ پجاری نے  
 کہنا شروع کیا۔ بات زیادہ دنوں کی ہو گئی۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو۔ ایک دن  
 اسی مہر میں سر راہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ تم نے مجھے بہت ذلیل کیا  
 تھا۔ میری عمر اور ڈاڑھی کا طعنہ دیتے ہوئے تم نے مجھے بڑی طرح رسوا کیا تھا  
 اس پر مجھے اس زندگی میں پہلی بار انتہائی غیرت اور ندامت محسوس  
 ہوئی تھی۔ میں نے صرف تمہارے لئے دنیا بھر کی ذلتوں اور رسوائیوں کو اپنا  
 مقدر بنایا تھا۔ اپنے مذہب کا سب سے بڑا اعزاز ٹھکرا کر صرف تمہاری ایک جھلک  
 کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھانا رہا۔ میں نے تمہاری خاطر اپنے دل پر بڑے  
 سے بڑا زخم برداشت کر لیا لیکن تمہارے ہاتھوں اس دن کی بے عزتی پر تڑپ  
 اٹھا میں تمہیں پانے کے لئے اپنی خوشحال اور مطمئن زندگی سے اتنی دُور آچکا  
 تھا کہ اب واپسی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اپنے عالمانہ وقار کو قربان کیا۔  
 لوگوں کی نگاہوں میں دھرم سے بے دھرم ہوا۔ تم نے اپنی بدنامی کے ڈر سے  
 اپنے وطن کو چھوڑ کر کشن مراری کے شہر متھرا میں پناہ لیا۔ اور مجھے میری جان  
 بے تاب نے بے گھر و بے در کر کے چھوڑا۔ اتنی دُور سے میں صرف تمہاری خاطر  
 اپنی جان کو بھینٹی پر رکھ کر متھرا میں داخل ہوا۔ مجھ پر رحم کھاتے کے بجائے بڑی  
 بے آبروی کے ساتھ تم نے مجھے دھتکار دیا۔ میرے درد دل کو نہیں سمجھا۔ مذہب  
 و سماج نے تمہیں مجبوریوں کی چپار دیواری میں قید کر دیا مگر میرے عشق  
 جنوں خیز کی سرحدوں کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ تم میں کسی جو گن کا جذبہ



انگڑائیاں نہ لے سکا جبکہ قیس و فرہاد نے میرے جذبے کو نئی راہ پر لاٹھکا۔ یہ میرے جذبے کی سچائی ہی تو ہے کہ میں آج ہندو دھرم کے سب سے بڑے منصب پر براجمان ہوں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایک مسلمان عالم متھرا کے مندر کا بڑا پردہت بھی بن سکتا ہے۔

تو کیا آپ نے میرے لیے اپنا مذہب بھی بدل دیا ؟

بظاہر تو میں نہ صرف ہندو بلکہ ہندوؤں کا سب سے بڑا پیشوا ہوں مگر خدا گواہ آج بھی میری رات کی تنہائی میرے سجدوں سے آباد ہے رات کے سناٹے میں جب اپنے ماضی کی طرف پلٹتا ہوں تو آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ سویرا کرتا ہوں مگر سورج کی ہر کرن تمہیں حاصل کرنے کا جنون ایسی جذبہ مجھے نئی ہمت عطا کرتی ہے یہ میرے جذبے کی تڑپ ہی تو ہے جو تمہیں یہاں تک کھینچ لائی۔

لیکن آپ مولوی سے پجاری کیسے بن گئے ؟ روپ و قی نے جھکتے ہوئے سوال کیا ؟

دونوں نظموں میں تو صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ میرے جذبے کی تڑپ نے مجھے مولوی سے پجاری بنا دیا۔

اتنا تو میں بھی سمجھتی ہوں کہ ایک عورت کے سچے پیار میں آپ مولوی سے پجاری بن گئے۔ مگر بنے کیسے ؟ یہ جاننا چاہتی ہوں ؟

اب سے تقریباً دو برس پہلے جب لاہور نئی نے مجھے سرراہ ذلیل و رسوا کر کے میری عمر اور وارثی کا مذاق اڑایا تھا۔ اس حادثے نے مجھے ہلا ڈالا اور قریب تھا کہ میں اپنے مقصد میں ناکام ہو کر ملک کے کسی دور دراز گوشے میں جا چھپتا۔ مگر پھر اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے جذبے نے مجھے

ایک نئی طاقت اور نیا جوصلہ عطا کیا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے ایک خطرناک  
 ترین فیصلہ کر ڈالا۔ بالآخر میں نے زندگی ہی داؤں پر لگانے کا فیصلہ کر لیا۔  
 سب سے پہلے میں نے دارٹھی منڈائی۔ ماتھے پر سجدے کی نشان کی جگہ  
 تشقہ لگایا اور گلے میں زنار ڈال کر اسی مندر میں بڑے پجاری مہاراج کے  
 پاس آگیا۔ پجاری جی نے مجھ پر رحم کھاتے ہوئے مندر میں بٹھرنے کی اجازت  
 دے دی۔ مندر کی صاف صفائی اور پجاری جی کی خدمت میں نے بڑی لگن  
 کے ساتھ انجام دینی شروع کی اور ساتھ ہی دھیرے دھیرے پجاری جی سے  
 ہندو دھرم کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ عربی فارسی اردو کا عالم تو میں پہلے  
 ہی سے تھا۔ وہی فطرت ذہانت میرے کام آئی اور بہت جلد میں نے ہندی  
 پر عبور حاصل کر لیا۔ اور ساتھ ہی پجاری جی کی خدمت میں نے بڑی اپنائیت  
 و خلوص کے ساتھ کرنی شروع کی۔ پجاری جی میری خدمات سے متاثر ہونے  
 لگے۔ اب وہ مجھ پر خصوصی توجہ دینے لگے یہاں تک کہ دھیرے دھیرے میں  
 ان کا مقصد خاص ہو گیا۔ ادھر قدم قدم پر قسمت میرا ساتھ دینے لگی۔ لاہوتی کو  
 حاصل کرنے کا مقصد ہمیشہ میرے سامنے رات دن جاگتے ہوئے کوئی لمحہ  
 ایسا نہیں گذرا جو اس سنگدل کی یاد سے خالی ہو۔ میں اپنی محبوبہ کو حاصل  
 کرنے کے لیے جو خطرناک ترین قدم اٹھا چکا تھا اس کا مجھے بری طرح سے  
 احساس تھا۔ ذرا بھی شن گن لگ جاتی تو میری ہڈیوں کا پتہ تک نہ چلتا۔  
 سب سے زیادہ اذیت ناک میرے لیے یہ احساس تھا کہ ایک عورت کے لیے  
 میں نے زندگی کو داؤں پر لگایا ہی تھا ایمان کو بھی عشق نامراد کی اس کھٹی  
 میں ڈال دیا۔ اگرچہ میرا دل مطمئن تھا۔ اسلامی عقیدے پر میرا ایمان  
 اس تھا مگر کفر کی ظاہری شکل و صورت اختیار کر لینے کے بعد مجھ میں رہ ہی

کیا گیا مگر وہ جس نے مجھے عقل و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا مجھ سے میری زندگی کی ساری خوشیاں چھین جانے کے بعد بھی میں اس کے دل میں اپنے لئے کوئی نرم گوشہ نہ پیدا کر سکا تنہائی اور حسرت و بے بسی کے عالم میں پھوٹ پھوٹ کے روتا۔ جب دل کی بھر اس نکل جاتی تو جلوہ یار کے تصور میں گم ہوتا اور جھوم جھوم کے پڑھتا ہے۔

بیاد دلربا خوشحال می باش گئے افضل گئے گوپال می باش  
 اوہ میں جذبات کی رومیں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پجاری جی میری خدمت، ذہانت، دنیا سے بے تعلق اور گیان دھیان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے مرتے وقت مجھے اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ چنانچہ آج مجھے تم اس منصب پر دیکھ رہی ہو یہ میری خدمات کا صلہ اور پجاری جی کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔

پجاری بن جانے کے بعد میرے لئے لاجوتی کو حاصل کرنا کچھ دشوار نہیں تھا لیکن میں اپنی بے لوث قربانیوں سے اس کے دل کو جیتنا چاہتا تھا تاکہ میرے عشق کو ہو بس کا نام نہ دیا جاسکے میں نے دو برس کا یہ طویل عرصہ کانٹوں اور انگاروں کی سیج پر گزارا ہے۔

مہاراج! اب بس کیجئے اب زیادہ سسٹننے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے یہ کہتی ہوئی لاجوتی پجاری کے قدموں پر گر پڑی اور روتے ہوئے کہنے لگی کہ مجھے کیا معلوم آپ میرے لیے اتنی بڑی قربانی دیں گے، اتنی بڑی تپسیا کریں گے مجھے معاف کر دیں۔ میں زندگی بھر آپ کی داسی بن کر رہوں گی اگر آپ بندوبست تو میں بند رہوں اور اگر آپ مسلمان ہیں تو میں مسلمان ہوں۔ روپا میری جان! تم بھی معاف کر دینا۔ میں نادان تھی۔ مجھے نہیں

معلوم تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے لئے اتنی بڑی قربانی دے سکتا ہے۔ میں نے اس سچی محبت کی قدر نہ کی اسے ہو س سمجھ کر ٹھکراتی رہی آج میری آنکھوں سے پردے اٹھ گئے ہیں۔ اُسٹھے مندر کی اس چہار دیواری سے کسی ایسی طرف چل نکلیں یہاں ہم مکمل آزاد ہوں۔“

ایک صبح حسب معمول مندر کی گھنٹی بجنے میں تاخیر ہوئی۔ بڑے پجاری کے نائب نے انتظار کے بعد مندر کے معمولات کو پورا کیا اپنے کام سے فارغ ہو کر جب دروازے پر دستک دی تو دروازہ کھٹکا چلا گیا کمرہ خالی نظر آیا۔ پجاری کو بہت تلاش کیا مگر پجاری پھر کبھی نظر نہ آیا۔

یہ کہانی ہے ”مولانا محمد افضل جھنجھانوی“ کی جو کمالات ظاہری سے آراستہ اردو ہندی، عربی فارسی کے زبردست عالم اور نامور شاعر گذرے ہیں۔ علی قلی خاں یاغستانی نے اپنی مشہور کتاب ”ریاض الشعر“ میں مولانا کو ایک بہترین شاعر کی حیثیت سے جگہ دی ہے۔ تذکرہ میر حسن میں بھی آپ کا ذکر ملتا ہے۔ بڑی عمر میں ایک ہندو لڑکی پر ایسے عاشق ہوئے کہ اس کی خاطر انھیں بڑے بڑے انقلابات سے گذرنا پڑا۔ انجام کار وہ مولانا کی قربانیوں سے متاثر ہوئی اسلام قبول کیا اور آپ کے نجات میں ہی مولانا نے اپنے عشق کی سرستیوں کو بارہ ماسہ عرف بگٹہ کہانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ بارہ ماسہ دراصل ہندی طرز کی ایک منظوم داستان ہے جو ہجراں نصیبی اور درد و فراق کی پرالم داستان پر مشتمل ہے۔ افضل کے بارہ ماسہ کی زبان بہت قدیم ہے۔ اور شمالی ہند کے اردو نظموں کی اولین شکلوں کی ایک شکل ہے۔ اس کے باوجود اس کی زبان کافی سلیس ہے اس نظم میں فارسی کی بندشیں بھی جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ ایک جگہ تو

آدھا تیترا آدھا بشیر کی جلوہ نمائی ہے سے

چہ سازم چوں کنم کس کن پکاروں جتن کیا عشق کے غم کا پجاروں

جنوں در ملک جانا بھنڈا گرٹا آیا سمجھ اور پوجھ کا تھانہ اٹھایا

چو شد مدت پیانے کے سنگ لہتے مر م با یک دگر کہتے و سکتے

چہ می بینم کہ منگل گاوتی ہیں مے گھر ناریاں سب آوتی ہیں

فارسیت کے اپنے غلبے کے باوجود بارہ ماہہ جذبات کے اعتبار سے

خالص ہندی کا ایک شاہکار ہے جس میں ہندوانہ طرز معاشرت کی بھرپور

نمائندگی کی گئی ہے۔

مولانا افضل کا انتقال ۱۰۳۵ھ میں ہوا

یہ عشق نہیں آساں تو جس کو سمجھتا ہے

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

# بھیک پیکوں کا بوجھ

”وہودزن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ“

لیکن تصویر کائنات کا یہ رنگ اسکی جگا ہوں میں دھندلا پر چکا تھا۔  
 نصف بہتر سپردگی کا تمام تر انداز لیے دعوت عمل بنی ہوئی تھی۔ حیات اپنی تمام  
 رعنائیوں، دلچسپیوں، دلفریبیوں کے ساتھ اس کے گرد رقص کناں تھی۔ مگر اس  
 کے ساتھ وہ اعتناء نہ کر سکا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بڑا متقی تھا بلکہ اس لیے کہ  
 شباب کی تمام تر مسرتیں اور جذبہ دروں کی جنوں نیزی اس کے لیے صبر  
 لمحاتی ثابت ہوئیں۔

کھلی جو آنکھ تو پھر زادرا حاصل نہ رہا

ایک بچے کا باپ ہونے کے بعد وہ دوسرا بچہ پیدا کرنے کی صلاحت  
 سے محروم ہو چکا تھا۔ قوت مردی کا وہ خزانہ جس سے تصویر کائنات خوش رنگ  
 نظر آتی ہے، خالی ہو چکا تھا۔ جس وقت اس پر اس خوفناک حقیقت کا  
 انکشاف ہوا۔ وہ سو جان سے کانپ اٹھا پچیس سال کی عمر کوئی بڑھا پے  
 کی عمر تو نہیں ہوتی۔ اپنی عمر سے کم بیوی جو اب تک صرف ایک بچے کی ماں  
 بن سکی تھی۔ آنے والی پہاڑی طویل زندگی کے رُوح فرسا تصورات نے  
 اسکے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ بیوی پر اس کمزوری کے اظہار سے پہلے اندر اندر  
 اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

بہار اب آکے کیا کرنے گی کہ جن سے تھا جشن رنگ و نغمہ

وہ گل سرشاخ جل گئے ہیں وہ دل تہ دام بچھ گئے ہیں

شرم و ندامت میں ڈوب کر بالآخر ایک دن بڑی ہمت سے کام لیکر  
مری ہوئی آواز میں اٹکتے جھمکتے اسے اس تلخ حقیقت کا اظہار اپنی بیوی  
پر کرنا پڑا۔ سننے ہی وہ دم بخود ہو کر رہ گئی۔ گریہ بے اختیار سے اسکی پلکیں  
نم آلود ہو گئیں چونکہ وہ رفیق حیات تھی۔ صرف شریک عیش و نشاط نہیں۔  
مشرقی لڑکیاں خصوصاً دیہات کی پتی ورتا میں بہت آگے ہوتی ہیں۔ ان کی  
ضمیر میں وفاداری کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ نمائش و الہانہ پن، طرح  
داری، عشوہ طرازی کے بجائے سادہ لوحی کے ساتھ وفاداری ان کا خاص  
وصف ہوتا ہے۔ ابتلاء و آزمائش کے وقت ان کی وفاداریوں کی ہمت  
بہت کم بدلتی ہے۔

ترک تعلقات کو اک لمحہ چاہئے۔ لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا  
آنکھیں دکھانے، سرد مہری کا مظاہرہ کرنے اور جلی کٹی سنانے کے بجائے  
اس نے اپنے شوہر سے عملی ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔ تسلی دیتے ہوئے سمجھایا  
آپ گھبراہٹیں نہیں یہ سب وقتی باتیں ہیں۔ آپ دوا کرائیں۔ خدا نے ہر  
بیماری کا علاج پیدا کیا ہے تو کیا اس کا علاج پیدا نہیں کیا ہوگا؟ آپ  
پوری کوشش کریں چاہے جتنا روپیہ خرچ ہو۔ پیسہ کیا ہے۔ ہاتھ کا میل!  
وہ پھر آجائے گا اور میرے لئے بالکل فکر نہ کریں۔ میں کل بھی آپ کی تھی۔  
آج بھی آپ کی ہوں۔ اور کل بھی تھری اور صرف آپ کی رہوں گی۔ یہ نقصان  
تہنا آپ کا نہیں۔ میں اس میں برابر کی شریک ہوں۔ دکھ کا یہ بوجھ اٹھانے  
میں آپ تہنا نہیں، یہ درد مشترک ہے میں آپ کی بیوی ہوں، جو رو ہوں،

دکھ سکھ آرام تکلیف کی ساتھی۔

بیوی کی ان تسلی آمیز باتوں سے اسے بڑا سکون ملا۔ پھر تو علاج معالجے میں اپنی سکت بھر کوشش میں لگ گیا۔ مگر سے مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اپنی توفیق کے مطابق ایک سے ایک سیانے، حکیم، ڈاکٹر سب کو دکھا کر تھک گیا مگر کسی طرف سے روشنی کی کوئی کرن نہیں دکھائی دی۔ شفاء نام کی چیز ہمیشہ اس سے دس قدم دور رہی۔ اب تو اس کا بچہ بھی بڑا ہو گیا۔ ادھر ادھر کھیلتا بھاگتا۔ بیوی نے بڑی ثابت قدمی کے ساتھ اس کا ساتھ دیا مگر کہیں سے چارہ گری نہیں ہوئی۔ ہر طرف سے تھک ہار کر مایوسیوں کے اتھاہ ساگر میں اس کا دل ڈوب کر رہ گیا ہے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں

اے فصل بہاراں رخصت ہو ہم لطف بہاراں بھول گئے  
دنیا کے حکیموں، ویدوں، ڈاکٹروں اور سیانوں سے جب وہ مایوس ہو گیا تو اُسے خدا مستوں کی یاد آئی۔ بالآخر ایک دانا آدمی کے مشورے پر وہ ایک اللہ والے، کی بارگاہ تک پہنچ ہی گیا۔ اللہ کے اس مقبول بندے کی صورت دیکھ کر اس کی بے قراری کو قرار آیا۔ اس کی مقدس پیشانی سے سعادت کی صبحیں طلوع ہو رہی تھی اور پر نور سرِ اُپاس سے ولایت کی بزرگی، پادشاہی، جہانگیری اور اقبال مندی کا آفتاب ہویدا تھا۔ اے صبح سعادت زجبین تو ہویدا

جمال و زیبائی، سطوت و جبروت اور جاہ و جلال کا ایسا پیکر مجسم کہ دل خود ہی اسکی طرف کھینچتا جائے سے



کہ شمع دامن دل می کشد جا ایں جا است  
اور اگر چند صحبتیں نصیب ہو جائیں تو ذل نیاز پیشہ کا اخلاص رنگ  
لائے تو پھر سے

ہوش کھوتا جائے ہے پردہ سا اٹھتا جائے ہے  
ایسا پروقاہ سراپا، ایسی صاحب اثر و نفوذ شخصیت، ایسا صاحب فضل  
و کمال، سنت نبوی اور شریعت مطہرہ کا اس قدر التزام شوق رکھنے والا۔ اس  
سے اچھا اچھے اچھوں نے کم ہی دیکھا ہوگا ع  
تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں

اور وہ بیچارہ تو تھا ہی ایک عام سا آدمی۔ کئی دن تک دور رہی دور  
سے دیکھتا رہا۔ کچھ عرض کرنے کی ہمت نہ کر سکا وفا آشنا بیوی ساتھ ہی ساتھ  
تھی۔ حالات کی کڑی دھوپ نے اسے وقت سے پہلے سنجیدہ، بردبار اور متین  
بنادیا تھا۔ اس کے گھوڑنے، اُکسانے، حوصلہ دلانے پر جھکتے اُٹکتے اُسے ہمت  
بھی ہوئی تو وہ اس مرد درویش نگہ التفات حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا  
کئی دن بیت گئے مگر وہ مردِ خدا مست اسے ٹالتا رہا۔ لوگوں کو اس سے زیادہ  
اس کی بیوی پر ترس آتا جو اس کے پیچھے بن کی کوئل بن چکی تھی۔

مزاج شناسوں نے دونوں میاں بیوی کو اچھی طرح ذہن نشین  
کرادیا تھا کہ تم لوگ مایوس یا بد دل نہ ہونا۔ دیر لگ سکتی ہے لیکن اپنے  
مقصد میں تم ضرور کامیاب ہوؤ گے۔ لاکھ ٹالے جاؤ، بہلائے جاؤ، ڈلٹے  
پھسکارے جاؤ۔ شس سے مس مت ہونا، تمہارے جیسے جاننے کتنے پریشان حال  
لوگ آئے دن آتے جاتے رہتے ہیں۔ پہلے وہ بہلائے جاتے ہیں، پھر ٹالے  
جاتے ہیں، پھر ڈالٹے اور پھسکارے جاتے ہیں، پھر بھگائے جاتے ہیں، ذلتوں

ان آزار کو جو لوگ جھیل جاتے ہیں وہ اپنی منزل پلٹتے ہیں اور جھیں اپنی اناؤ  
کے مجروح ہونے کا احساس شدید تر ہوتا ہے۔ حرمٰں نصیبی ان کا مقدر بن جاتی  
ہے۔ پھر تو ع

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں  
بالآخر ایک دن رحتوں کا سویرا ہوا۔ مشیتِ ایزدی کو اس پریشاں حال  
دیہاتی پر رحم آگیا۔ قبولیت و اجابت کی ساعتِ سعید کی وہ مبارک منزل ہی  
پہنچی کہ جہاں پر سے  
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

کا اجالا پھلتا ہے۔

مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا وہ قدسی صفات بندہ اپنے  
معمولات سے فارغ ہو کر بسترِ ناز پر تشریف فرما ہو چکا تھا۔ سفید بے داغ بستر  
پر سر ہانے پینٹانے دو دو سفید تکیے! شمع کو پروانوں نے ہر طرف سے گھیر لیا  
تھا۔ آہستگی اور شستگی کے ساتھ میٹھے مدھر لہجے میں سلسلہ کلام جاری  
تھا۔ لبہائے ناز پر دلاؤیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اتنے میں اسی کرموں جلے  
کی آواز ابھری! اے حضور! ہمیں اچھا کر دیجئے!

» کون ہو بھائی؟ «

» میں ہوں عبدالعزیز سرکار «

» کہاں رہتے ہو؟ «

» راج نیپال میں سوئی برگدوا ایک گاؤں ہے وہیں کارہنے والا ہوں۔

حضور! میں بہت پریشان حال ہوں۔ اپنی سکت بھر دوا دارو کر کے تھک چکا ہوں  
حکیموں، ڈاکٹروں کی کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔ بڑی آس لے کر آپ کے پاس

آیا ہوں۔ مجھ پر رحم کریں میرے لئے دعا کریں۔

» ارے بھائی عبدالعزیز! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اس لائق ہوں؟  
اگر میں اس لائق ہوتا تو خود ہی اچھا نہ ہو جاتا؟ آئے دن حکیم قیصر کے یہاں ناپار  
جاتا رہتا ہوں دو اکرا لے کے لیے۔ جاؤ مولانا لوگوں سے دعا کرو وہ نائب  
رسول ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں زیادہ قبول کرتا ہے۔ میرے پاس  
کیا ہے؟ میں کس لائق ہوں؟ «

بڑی خوبصورتی کے ساتھ آپ نے اسے ٹالا۔ مگر وہ بدصوبھی اتنا دن  
رہتے ہوئے نیم ہوشیار ہو چکا تھا اور بھائی لوگوں نے سکھا پڑھا کر کسی حد  
تک پکا کر دیا تھا۔ خوشگوار موڈ اور زیر لب تبسم نے اسے حوصلہ بخشا۔  
ٹمے سادگی اور بھولے پن سے کہنے لگا: » اچھا حضور! تو روپیہ لیکر اچھا کر دیجئے «  
اس کی سادہ لوحی نے اہلی محفل کو زعفران زار کر دیا۔ آپ بھی ایک

جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئے مستکراتے ہوئے فرمایا: » ہاں دوست! یہ بات تم  
نے کام کی کی ہے۔ آخر میرے بھی بال بچے ہیں۔ دس بیس آدمی آئے دن  
ہمان ہوتے ہیں۔ اتنے لوگ آتے جاتے ہیں مگر تم ہی ایک کام کے آدمی  
بکلیے۔ اور سب کو تو صرف اپنی غرض سے غرض ہوتی ہے۔ میری ضرورتوں  
کے لیے نہیں سوچتے۔ اپنی کوئی تجارت نہیں، کوئی کھیتی باڑی نہیں۔ کوئی  
ملازمت نہیں آخر اتنا لمبا خرچ۔ چلو اگر کسی نے نہیں تو تم نے تو سوچا۔ شاباش  
میرے دوست! اچھا بتاؤ تو سہی کتنا روپیہ دے رہے ہو اچھا کرانی؟ «  
» دو سو روپے لے لیجئے حضور! اور ہمیں اچھا کر دیجئے «

» بھلا دو سو روپے سے کیا ہوگا؟ اتنے سے کون سا کام بنے گا؟ اگر یہی  
بات ہے تو تم مجھ سے چار سو روپے لے کر مجھے اچھا کر دو۔ کم از کم حکیم قیصر کے

یہاں جانے آنے سے تو فرصت مل جائے اپنے خادم خاص چودھری دوست محمد سے فرمایا، چودھری صاحب عبدالعزیز بھائی کو چار سو روپے دے دو۔ یہ ہمیں اچھا کر دیں۔“

” اچھا سرکار! چار سو روپے لے لیجئے مگر ہمیں ضرور اچھا کر دیجئے۔“  
” چودھری صاحب! بھائی عبدالعزیز کو آٹھ سو روپے دے دو۔ یہ ہمیں اچھا کر دیں۔“  
اب تو غریب بہت حیران و پریشان ہوا کہ اب کیا ہوگا؟ یہاں تو ڈبل بولی بولی جاتی ہے۔ مگر وہ ہمت نہیں ہارا۔ اہل محفل اس مکالمے سے کچھ ہنس رہے تھے کچھ مسکرا رہے تھے اور کچھ اس کی سادہ لوحی اور بے وقوفی پر ترس کھا رہے تھے۔ ایک بار پھر وہ ہمت کر کے روتی ہوئی آواز میں کہنے لگا، ”حضور! دوا کرانے میں بڑا روپیہ خرچ ہو گیا۔ میری ساری تڑی تا بڑی ختم ہو چکی ہے۔ اب پانی پانی میرے پاس صرف چھ سو روپے بچے ہیں۔ یہی لے لیجئے اور ہمیں اچھا کر دیجئے۔“ اتنا کہہ کر رو پڑا۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔ اسکی اس کیفیت اور کہنے کے انداز نے محفل پر سناٹا طاری کر دیا۔ آپ بھی خاموش ہو گئے۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس مرد خدا مست پر ڈھیروں برف ڈال دیا ہو۔ کیونکہ ایسے لوگ بڑے سے بڑا غم برداشت کر سکتے ہیں، بڑی سے بڑی کلفتیں اور اذیتیں خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل جاتے ہیں مگر کسی غریب کی ”بھگی پلکوں کا بوجھ“ ان سے نہیں اٹھتا ہے۔

اشک میرے ہیں مگر دیدہ نم ہے اس کا  
یہی ان نفوس قدسیہ کے گھر کی ریٹ رہی ہے۔ یہی ان کا وطیرہ رہا  
اور یہی روایت! تھوڑی دیر تک بڑا بوجھل سناٹا طاری تھا کہ اللہ کے

اس برگزیدہ بندے کی آواز ابھری » عبد العزیز! جی سرکار! ادھر دیکھو وہ کنویں پر جو نالی بنی ہے اس پر بیٹھ کر نمازی لوگ وضو کرتے ہیں۔ کل صبح تم اس نالی کے اندر جو بھی کچر اکائی ہو اُسے صاف کیا کرو۔ تم کو ثواب بھی ملے گا کہ ایک طرح سے نمازیوں کی خدمت ہوتی ہے۔ اور ادھر دیکھو اس کو بنے میں ایک گونی بٹکی ہوئی ہے احاطہ پاک میں یا باہر راستے میں عربی و فارسی اردو میں لکھا ہوا کوئی کاغذ پڑا دیکھو تو اسے اٹھا کر اس بوری میں ڈال دیا کرو۔  
بس جاؤ۔

اس کی دوسری صبح لوگوں نے دیکھا کہ وہ ڈیوٹی پر لگ چکا ہے۔ جب دیکھو نالی صاف کرتا نظر آتا یا احاطہ پاک میں لکھا ہوا زمین پر پڑا کاغذ چنتا ہوا ملتا۔

ٹھیک پندرہ دن بعد وہ پھوٹا ہوا۔ بارگاہ کرم میں حاضری کا تو انداز وہی تھا مگر چہرے کی صحت و توانائی کی سُرخی اور سکون و مسرت کا پھیلا ہوا اجالا بتا رہا تھا کہ اس کی محرومیوں کے طویل شب کی صبح ہو گئی۔ زندگی سے بھرپور آواز میں عرض کرنے لگا۔

» حضور! اب ہمیں چھٹی دے دیں۔

» کیوں بھی عبد العزیز! کیا تم اچھے ہو گئے؟

» ہاں سرکار ہم اچھے ہو گئے۔ ایک دم سے اچھا ہو گیا سرکار جیسے پہلے تھا

ع میرے ہونٹوں پہ تبسم یہ کرم کس کا ہے

» بھائی مبارک ہو۔ اللہ نے تمہیں اپنے فضل سے صتمند کر دیا۔ اچھا تو

پھر کب آؤ گے؟

» جب جب حضور کا حکم ہو۔

” اچھا جاؤ لیکن سال میں ایک بار ضرور آتے رہنا۔  
 ” نہیں سرکار! ہم تو سال میں کئی بار حاضری دیں گے۔“  
 ” کئی بار تو تم آ ہی نہیں سکتے۔ کسان آدمی ہو فرصت ہی کم ملے گی۔ مگر  
 سالانہ بھنڈا رے (جلسے) میں تم ضرور آنا اور اس حاضری کو اپنا معمول بنالینا۔“  
 وہ غریب خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ آپ کو دعا میں دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔  
 نہ پوچھا ان خرقد پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو  
 ید بیضائے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں  
 یوں تو خوش بختیاں، فیروزندیاں، ارجمندیاں خود ہی اس کی  
 بارگاہِ ناز میں چشم و ابرو کی منتظر رہا کرتیں، اس کی برکتوں کے فیضان  
 نے تیرہ بختیوں کو بخت رسا اور محروموں کو خوش نصیب بنا دیا۔ پستیاں  
 اس کے قدموں سے لپٹ کر نقطہ عروج کا اعزاز حاصل کرتیں۔ کتنے کنگلے فقیر  
 چرواہے اس کی ایک نگہ کیما اثر سے مسند اعزاز کے صدر نشین بن گئے۔ مگر  
 وہ آج خود اپنے نصیب کی ارجمندی پر نازاں ہے۔ جسکی ایک نگہ البقات کے لیے  
 امیر رئیس، منصب دار، جوارے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ آج وہ خود  
 عالم سرخوشی میں سراپا نیاز بنا ہوا ہے کہ اس کے صحن حرم وہ تشریف لایا  
 (خواب ہی میں ہی) جو اقلیم ولایت اور کائنات عشق کا تاجدار تھا، عالم اسلام  
 کا ہستی معتبر تھا، بحر تدقیق و تحقیق کا شناسا اور تھا۔ علوم و فنون کا شہسوار  
 تھا۔ فضل و کمال کا شہر یار تھا، ملت بیضا، کا محافظ، اسلام کا حامی  
 و ناصر اور ناموس رسالت کا پہریدار تھا۔ جس نے محبت رسول کے کشت  
 ویراں کو لالہ زار کیا۔ دل کی ریگزار وادیوں میں عقیدت کے چشمے جاری کئے  
 دشت وحشت میں محبت کے پھول کھلائے۔ دل خانما برباد کو آباد کیا۔ بادِ فنا

کارخ موڑا۔ اور آندھیوں کی زد پر عشق کا چراغ جلا لیا۔ جو اپنے آقا کی چوکھٹ کا گدا مگر اپنی مسند فیض و عطا پر سلطان عشق تھا۔ جس کے عشق جاں سوز کی صدائے دلنواز ایک گوشے سے ابھری، پھر دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کو اپنی پیٹ میں لیتے ہوئے اقصائے عالم پر چھا گئی۔ بر اعظم ایشیا، یورپ، امریکہ اور قیبریا۔ دیوالوں کی محفل میں وہی "بلبل ہزار داستان" نواسخ نظر آتا ہے ع

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام  
جسے دنیائے عرب و عجم کے ارباب علم و دانش اور اصحاب فضل و کمال نے  
بڑے احترام و عقیدت کے ساتھ "مجتہد اعظم اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا بریلوی  
سے یاد فرمایا۔

کہا جاتا ہے کہ عام بندہ مومن کا خواب نبوت کا پھیلا لیسواں حصہ ہوتا ہے۔ مگر جب کوئی مقبول بارگاہ حق خواب دیکھتا ہے تو خواب زیادہ حقیقتوں کا نقشہ اس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ رونما ہونے والے اہم ترین امور غیبیہ کا روشن آئینہ اس کے ہاتھوں میں دے کر قدرت واضح انداز میں اسکی رہنمائی کرتی ہے۔ ع  
جن کے رتبے ہیں سو ان کے سوا مشکل ہے

اس نے دیکھا کہ اس کی خانقاہ کے وسیع برآمدے میں اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا بریلوی تشریف لائے ہیں۔ وہ احمد رضا، جن کا انتظار بارگاہ رسالت پناہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں بھی ہوتا رہا۔ عبقری الشرق عالم اسلام کی عظیم المرتبت بستی نے اپنے قدوم مہمنت لزوم سے اس کی خانقاہ کو عزت بخشی ہے۔ ابھی وہ تشریف لا کر بیٹھے ہی تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے

آپ کے گرد انسانوں کا کثیر جمع ہو گیا اور لوگوں نے ہر طرف سے آپ کو گھیر لیا۔ آنکھوں میں احترام و عقیدت کی چمک کے بجائے خصومت و غضب کی ہوس ہے پھر ہر طرف سے سوالات کا سلسلہ شروع ہوا اور بتدریج اس میں جارحیت پیدا ہوتی گئی۔ آپ ہر ایک کو دلائل و براہین کی روشنی میں مسکت جواب دیتے ہیں۔ دندان شکن جواب سن کر بجائے خاموش ہو جانے یا مان لینے کے کٹ جتنی پر اتر آتے ہیں۔ اگر ایک طرف سے سوالات کا سلسلہ کچھ نرم پڑتا تو فوراً دوسری طرف جارحانہ یورش شروع ہو جاتی۔ آپ تنہا بدخوا ہوں، شورش پسندوں کے زغے میں ہر طرف سے سوالات جارحانہ کی مسلسل یلغار کیلئے ان حملوں کی دفاع میں پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں اور وہ مرد جاں نثار عالم اضطراب میں کبھی آپ کے دائیں بائیں کبھی آگے پیچھے ہوتا رہا۔ بالآخر تھوڑی دیر کے بعد شکست کی ذلتوں سے دوچار ہو کر وہ سب راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔

بدخوا ہوں، بد مذہبوں، شوہ پستوں کے بھاگ جانے کے بعد جب قدے سکون ہوا تو اس آبروئے عشق و وفا نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ دشمنوں کے زغے میں تمہارا وجود بڑا غنیمت ثابت ہوا۔ مگر اضطرابی کیفیت میں تمہارا بار بار میرے آگے پیچھے دائیں بائیں ہونے کا کیا مطلب تھا؟

حضور والا! برصغیر ہند میں آپ کی ذات علم و یقین، عشق و عرفان کا سرچشمہ ہے۔ برصغیر میں ناموس رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گرد آپ کی زبان و قلم نے بڑا سخت پہرہ قائم کر رکھا ہے۔ عشق رسالت کے



ساتھ ناموس رسالت کی پرہیزی کا اعزاز بھی حضور والا کو حاصل ہے۔ میں  
 اپنے طور پر محسوس کیا کہ ان ظالموں کی نیت اچھی نہیں اور اس چشمہ فیض کو  
 نقصان پہنچانے کے ذریعے آزاد ہیں تو بسطرف ہجوم زیادہ ہو جانا تھا میں  
 اسی طرف ہو جاتا تھا کہ مبادا آپ کی ذات والا صفات کو وہ کوئی نقصان پہنچاتا  
 چاہیں تو میں آپ کی ڈھال بن جاؤں۔ اگر میرے گھر میں حضور کی ذات کو ذرا  
 بھی نقصان پہنچ جاتا تو میں اپنے کو زندگی بھر معاف نہیں کرتا۔ اور کہیں  
 بارگاہ رسالت سے جواب طلبی ہو جاتی کہ اپنے گھر میں تو میرے عاشق و  
 جاں نثار اور میرے ناموس کے پرہیزی کی حفاظت نہ کر سکا؟ تو پھر کیا جواب  
 دیتا؟ اس لیے میں نے طے کر لیا تھا کہ اپنی حیات کی آخری سانس تک آپ  
 پر آنچ آنے نہیں دوں گا۔ یہی سب سوچ کر کبھی حضور کے آگے کبھی دائیں  
 کبھی بائیں ہو جاتا تھا۔ خدا کا شکر و احسان ہے کہ اس نے اپنے اس گنہگار  
 بندے کی لاج رکھ لی۔

رات کے پھلے پہر جب آپ کی آنکھ کھلی تو اپنے ارد گرد عشق و وفا کی  
 خوشبو محسوس کی۔ رات کے خواب کا نقشہ سطح ذہن پر ابھرتا چلا گیا۔ فجر کی  
 نماز کے بعد جب تعبیر کی فکر ہوئی تو معاً تصور میں ایک جھماکہ ہوا کہ یہ خواب  
 زیادہ مشیت کا واضح اشارہ ہے کہ یہاں ایک دینی قلعہ تعمیر کیا جائے جس میں  
 قرآن و حدیث کی تعلیم اور دین پاک مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ترویج  
 و اشاعت ہو۔ بالخصوص مسلک اعلیٰ حضرت امام احمد رضا (جو دراصل  
 مذہب اہل سنت اور مسلک امام اعظم ابوحنیفہ ہے) کی نشر و اشاعت  
 کی جائے خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی تاکہ اسلام و سنت کا اجالا چاروں  
 طرف پھیل جائے۔ چنانچہ کافی غور و خوض کے بعد اپنے وسیع و عریض خانقاہ

میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ چودہویں صدی کے نصف آخر کے پہلے عشرے میں ڈور ڈور سے علماء و مدرسین بلائے گئے۔ اور پھر خالص اس روحانیت کی آماجگاہ میں قال اللہ وقال الرسول کی صدائے دلنوازا بلند ہونے لگی۔ اسکی نیت کے اخلاص کا یہ عالم تھا کہ ایسے ماحول میں جبکہ ادارے خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی اپنے باپ دادا کے نام سے منسوب ہوتے تھے اس نے خالص رضائے الہی و عشق رسالت پناہی کے پیش نظر اپنے بیکراں اخلاص کا زبردست مظاہرہ کرتے ہوئے اس «ذات جامع الصفات» کے نام منسوب کیا جس نے گیتی کی زلف برہم سنواری، حیات کا چہرہ نکھارا، اور انسانیت کی مردہ رگوں میں زندگی کا گرم گرم لہو عطا کیا۔ ظلم و جہل کی تاریکیوں میں علم و یقین کا اجالا پھیلایا اور ساری کائنات کو عرفان و آگہی کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ معلم کائنات، محسن کائنات حضور پر نور روحی فداہ جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت گرامی سے منسوب کرتے ہوئے اس کا نام دارالعلوم فیض الرسول رکھا۔

استاذ الاساتذہ مجمع البحرین حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی سابق شیخ الحدیث فیض الرسول براؤں شریف نے استفسار فرمایا۔ حضور والا! فی زمانہ اکثر دیکھنے میں آیا کہ لوگ اپنے اداروں کے نام اپنے نام پر رکھتے ہیں تو اس ادارے کا نام «مدرسہ یار علویہ»، رکھنے کے بجائے «فیض الرسول» کیوں رکھا؟

آپ نے فرمایا مولانا مدرس و تدریس کا یہ دینی ادارہ در سرکار رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فیض ہی فیض ہے اس لیے اس کا نام «فیض الرسول» ہی مناسب تھا۔ اپنے نام و نمود کو دخل

دینے سے اخلاص باقی نہیں رہ جاتا ہے

ہو گئی دل کو تیری یاد سے اک نسبتِ خاص

اب تو شاید ہی میسر بھی تنہائی ہو

جس دور میں آپ نے «فیض الرسول» کی بنیاد رکھی۔ اطراف و جوانب

میں ڈور ڈور تک جہالت کی تاریکی کا یہ عالم تھا کہ نماز جنازہ پڑھانے کے لئے

صحیح تلفظ سے غاری معمولی پڑھے لکھے آدمی کی تلاش میں کئی کئی گاؤں کا

چکر لگانا پڑتا۔ اس پر بھی خوش نصیبی سے کوئی مل جاتا تو سبحان اللہ ورنہ

بغیر نماز جنازہ پڑھے میت کو دفن کر دیا جاتا۔ اور قبر کے سرہانے ایک لکڑی

گاڑ دی جاتی جو اس بات کی علامت ہوتی کہ اس قبر میں جو میت مدفون ہے

اسکی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی ہے اگر حسن اتفاق سے کوئی پڑھا لکھا آدمی

اس قبر سے گزرے تو صاحب قبر کی نماز جنازہ پڑھ دے۔ قیاللعجب۔

اور آج فیض الرسول کے فیضان کی برکت ہے کہ بستی، گونڈہ، علاقہ

بھانپھر، نیپال کے بارڈر سے لیکر اندرون نیپال تک علم کا اجالا ہی اجالا ہے

گاؤں گاؤں مدرسے، مکاتب اور علمائے دین کی بہتات ہے۔ علاقائی و

صنعتی سطح سے بہت آگے زور ڈور تک اندرون ملک فیض الرسول کا چشمہ

فیض جاری و ساری ہے۔ اور اب تو بیرون ملک بھی فیض الرسول

کے فیض کا چشمہ سیال لہریں لینے لگا۔ اللہم زد فرزد۔

ہندوستان میں چودھویں صدی ہجری کے نصف آخر کی ابتداء

میں طبقہ صوفیاء میں آپ پہلے فرد ہیں جنہوں نے اپنی خانقاہ کو شریعت و

طریقت کا بہترین سنگم بنایا۔ خالص روحانیت کے ماحول میں علمائے

شریعت کو دین پاک مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ترویج و اشاعت

کے لیے جمع فرما کر ان کا ایسا اعزاز و اکرام فرمایا کہ مدارس اسلامیہ کے ارباب بست و کشاد کی طویل فہرست میں اس کی مثال نایاب کی حد تک کیاب ہے اس مردِ خدا مست کے اخلاص بے پایاں کا نتیجہ ہے کہ فیض الرسول آج اسلامی علوم کا ایک شہر بن چکا ہے۔ اپنی چند در چند امتیازی خصوصیات کی بنیاد پر ہندوستان بھر میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آج پورے ملک میں الجامعۃ الشرفیہ مبارک پور کے بعد اپنے الہ و ما علیہ کے اعتبار سے اپنی نوعیت کا وہ ایک منفرد ادارہ ہے۔ عوام تو ذور رہے خواص کو بھی جانے دیجئے انھیں انھیں کا وہ طبقہ جن کی شخصیت آفاقی اور جن کے فکر و نظر پر سواد اعظم اہل سنت و جماعت کو اعتماد ہے ان کا اعتراف و رجوع اس بات کا غماز ہے کہ اس مردِ خدا آگاہ کے اخلاص بے پایاں کی جڑیں بہت گہری ہیں۔

سوال المکرّم ۱۴۰۶ھ میں سلسلہ اشرفیہ کے تاجدار، اکابر علماء کرام کے مرکز عقیدت حضرت علامہ سید محنت دار اشرف صاحب قبلہ اشرفی جیلانی سجادہ نشین سرکار کلاں کچھوچھو شریف کا اپنے پوتے کی تسلیم و تربیت کے لیے "فیض الرسول" کا خصوصی انتخاب حضرت مولانا سید نعیم اشرف والد گرامی حضرت مولانا سید کلیم اشرف جاسی کا اپنے ذہین ترین و بلند اقباب شہزادگان سید علیم اشرف و سید تقسیم اشرف کی تعلیم و تربیت کے لیے فیض الرسول کو پسند فرمایا۔ اہل سنت کے قیمتی سرمایہ، زبان و قلم کے بادشاہ، صاحب فکر و نظر، اردو اور مذہبی ادب کی آبرو، حضرت علامہ ارشد القادری کا اپنے لڑکے اور فیض العارفین مولانا غلام آسی برادر اکبر علامہ ارشد القادری کا اپنے نواسے کی تسلیم و تربیت کے لیے "فیض الرسول"

کا انتخاب! — یہ فیض الرسول کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے جو دراصل  
 اسی مرد درویش کی روحانیت کی جلوہ سامانیاں ہیں سے  
 یہ فیضان نظر تھا کہ مکتب کی کرامت تھی  
 سکھائے جس نے اسمعیل کو آدابِ فرزندگی  
 اسم گرامی :- آپ کا اسم گرامی شاہ محمد یار علی ابن فخر علی ہے  
 ستائیسویں پشت میں آپ کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنفیہ سے ہوتا ہوا  
 مولائے کائنات شیرازہ مشکل کشا حضرت مولا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے  
 جا ملتا ہے اور اٹھارویں پشت میں آپ کے جدِ اعلیٰ اور سلطان الشہداء  
 حضرت سید سالار مسعود غازی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دادا ایک ہو جاتے  
 ہیں آپ کا سن ولادت ۱۳۸۷ھ اور سال وفات ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۲ مئی  
 ۱۹۶۷ء جمعرات کا دن گذر کر شب میں ایک بجکر پچیس منٹ پر ہے۔ کل عمر  
 شریف اسی برس۔

وَطَنَ مَالُوفٍ - یُوَپِي كَے مشہور ضلع بستی میں شہر بستی سے  
 جانب شمال ساٹھ کلومیٹر دور! بائسی تحصیل سے جانب مغرب نومیل ایک  
 مقام براؤن شریف ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ ہندوستان میں قیام  
 کے لیے پہلی بار بارہ بنگی آئے۔ چنانچہ سلطان الشہداء حضرت سید سالار  
 مسعود غازی کے والد گرامی سالار ساہو جو سلطان محمود غزنوی کے ایک نامور  
 جرنیل تھے (جن کے عقد میں محمود غزنوی کی بہن اور سلطان ناصر الدین سبکتگین  
 کی بیٹی بی بی ستر معلیٰ تھیں جو سید سالار مسعود غازی کی والدہ تھیں) ان کا  
 مزار پاک بارہ بنگی کے مشہور قصبہ سترکھ میں آج بھی مرجِ خلاق ہے۔  
 پھر وہاں سے منتقل ہو کر میر پور بہرائچ آباد ہوئے۔ انقلاب ۱۹۷۷ء

سے پونے دو صدی پیشتر آپ کے دادا خورشید علی نے تیر پوہرا چ کو چھوڑ  
کر براؤں شریف کی مستقل سکونت اختیار کی۔

بایں ہمہ نسبی کرامت آپ نے حسب و نسب کو کبھی اپنے لیے باعث  
افتخار نہیں جانا بلکہ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم اور ولا فضل  
للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی کلکم من بنی آدم و آدم  
من التراب کے مطابق آپ نے حسب و نسب کے بت کو اپنے پاس کبھی  
پھٹکنے ہی نہیں دیا کہ اسلام میں بزرگی کا معیار کبھی بھی خالص حسب و نسب نہ رہا  
بلکہ بزرگی کے لئے سب سے بڑا معیار خشیت الہی و تقویٰ خداوندی مانا گیا ہے

حسن زبیرہ بلال از حبش صہیب از روم

زخاک مکہ ابوہیل ایں چہ بو العجمی است

اس لیے اگر کوئی آپ سے حسب و نسب کے متعلق پوچھتا تو آپ فرماتے  
میں ایک گنہ گار سنی مسلمان ہوں، اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا  
بریلوی سے والہانہ لگاؤ اور شدید جذباتی وابستگی تھی کہ دونوں کا قدر  
مشترک ”عشق رسول“ تھا۔ اگرچہ زمانہ پاتے ہوئے ظاہری ملاقات نہ  
ہو سکی۔ ماتھے کی آنکھوں سے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کو نہیں دیکھا تھا۔ عشاق  
بارگاہ رسالت کے قافلہ سالار حضرت خواجہ اویس قرنی نے بھی زمانہ  
پاتے ہوئے حدیہ کہ مدینہ منورہ میں حاضری دینے کے باوجود سید السادات  
فخر موجودات آقائے کائنات سرکار رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
کو ماتھے کی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر کیا کسی دیکھنے والے سے ان کا  
جذبہ سوز دروں کم تھا؟ یہ تپ سینہ سوزاں ہی کا تو فیضان تھا کہ  
انہیں بارگاہ رسالت سے خلعت زریا عطا ہوئی اور ہمیشہ کے لیے عشق

کی سروری کا اعزاز عطا ہوا۔

ان کے سچے نائب اور برصغیر ہند میں کاروانِ عشق کے سپہ سالارِ اعظم  
سیدنا امام احمد رضا کو شعیب الاولیاء شاہ محمد یار علی نے ماتھے کی آنکھوں  
سے نہیں دیکھا تو کیا ہوا؟ اپنے خانہ دل میں آپ کی عقیدت و محبت کا جو  
جراغ آپ نے جلا رکھا تھا۔ علم دین کی اشاعت اور عشق رسول کی  
تبلیغِ لُحَبِّ فی اللہ و البغض فی اللہ کا عملی مظاہرہ جو اعلیٰ حضرت  
کا مشن خاص تھا۔ صوفیاء و عرفاء کے طبقے میں اس کی طرح کس نے آگے  
بڑھ کر اس غیر معمولی بوجھ کو اپنے تو انا اور مضبوط کاندھے پر اٹھایا؟ اور  
گھر گھر علم دین و محبت رسول کا اجالا پھیلا یا۔

مَرْحَبَا لے عشقِ خوش سوداے ما

اے دواے جملہ علتہاے ما

شیرِ بیشہ سنت حضرت علامہ حسمت علی خان لکھنوی سے قلبی لگاؤ دراصل  
یہ سرکارِ اعلیٰ حضرت سے بیکراں عقیدت کا شاخشاہ تھا۔ بستی، گونڈہ، فیض آباد  
نانپارہ وغیرہ اپنے مریدوں میں شیرِ حق کو لے کر دورہ کیا، جگہ جگہ جلسے منعقد  
کرائے۔ جلسوں، مناظروں، مقدموں میں شیرِ حق کا بھرپور تعاون اور  
حق رفاقت ادا کیا۔

ولادت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے موقع پر براؤن شریف  
میں بڑے عظیم پیمانے پر جشن مناتے، خوش عقیدہ مسلمانوں کا تاریخی  
اجتماع ہوتا۔ جلیل القدر علمائے کرام کی تقریریں ہوتیں۔ کتب فروشوں  
سے سرکارِ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کی سیکڑوں روپے کی کتابیں لیکر  
مفت تقسیم فرماتے۔

ہندوستان کے اپنے تاریخی سفر میں اپنے مرکز عقیدت سلطان عشق  
سیدنا امام احمد رضا کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ فاتحہ خوانی کے وقت آپ  
کے دل و دماغ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ آنکھیں بند چہرہ آنسوؤں میں  
ڈوبا ہوا ہے

لب واپیں آنکھیں بند ہیں پھیلی ہیں جھولیاں  
کتنے مزے کی بھیک تیرے پاک در کی ہے  
حضور والائے اپنی زبان فیض ترجمان سے خود ہی بیان فرمایا۔ « اعلیٰ حضرت امام  
اہلسنت کے مزار پاک پر حاضری و فاتحہ خوانی کے وقت مجھ پر ایک گہری  
کیفیت طاری تھی جس کا نقشہ میں الفاظ میں نہیں کھینچ سکتا۔ عارف  
باللہ، عاشق رسول، عالم باعمل، مجدد دین و ملت کو گویا میں اپنی آنکھوں  
دیکھ رہا تھا ہے

نہ دوری دلیل صوری بود  
کہ بسیار دوری ضروری بود  
خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی کا خراج عقیدت

ملاحظہ ہو :-

« شیخ المشائخ شعیب الاولیاء، عارف حق حضرت علامہ صوفی شاہ  
محمد یار علی علیہ الرحمۃ والرضوان اس صدی کے ان بزرگوں میں سے  
ہیں جن کی ولایت و بزرگی کو اکثر علمائے کرام و مشائخ عظام اوابے شمار  
عوام و خواص نے تسلیم کیا۔ مجھے بھی اس کا شرف حاصل ہے کہ میں نے انکا  
زمانہ ہی نہیں پایا۔ بلکہ متعدد بار ان کی زیارت سے مشرف ہوا۔  
نانپارہ ابھراٹھ) کے ایک تاریخی اجلاس میں (جو حضرت علیہ الرحمۃ



کے زیرِ صدارت تھا۔ جس میں مناظرِ شیرِ بیشہ اہلسنت مظہر اعلیٰ حضرت مولانا حشمت علی خان صاحب لکھنوی علیہ الرحمۃ والرضوان بھی شریک تھے۔ رئیس نانپارہ حاجی ضیاء اللہ صاحب کا دولت کدہ ہم سب کی قیام گاہ تھا۔ اس سفر میں حضرت علیہ الرحمۃ کو میں نے بہت قریب دیکھا اور ان کے اخلاص و محاسن اور خرد نوازی سے بحد متاثر ہوا۔ وہ ایک متصلب سنی صحیح العقیدہ مردِ درویش ہی نہ تھے بلکہ سیدنا امام احمد رضا بریلوی سے والہانہ عشق بھی رکھتے تھے۔ یہی وہ قدرِ مشترک تھا جس نے حضرت شیرِ بیشہ اہل سنت اور حضرت شیخ المشائخ کو قریب تر کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ زندگی کی آخری سانس تک مسلک اعلیٰ حضرت کے نمائندہ و ترجمان تھے۔

تنزل و انحطاط کے اس ہوشربا دور میں جبکہ دھیرے دھیرے خانقاہوں سے علم اٹھتا جا رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے دارالعلوم فیض الرسول کی بنیاد ڈال کر اپنی خانقاہ کو علمِ ظاہر و باطن کا سنگ بنیاد بنا دیا اور علمائے حق کا کارواں اتار کر علم کا ایسا چراغ روشن کیا ہے جو ہمیشہ کے لئے ان کی علمی یادگار بن گیا۔

(سوانح حیات شیخ المشائخ :- از مولانا نسیم بستوی)

**عبادت و ریاضت :-** عبادت و ریاضت، زہد و اتقا، قناعت و استغناء، خاصانِ خدا کے یہ زیور ہوتے ہیں۔ بزرگانِ دین کی سیرت میں ان سب کا تذکرہ بطورِ خاص ملتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی عبادت و ریاضت، توکل و استغناء، قدم پر شریعتِ مطہرہ کا احترام و التزام بالخصوص نماز باجماعت تکبیر اولے کی پابندی یہ آپ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ متعدد بار حج و زیارت کے

وقت بھی آپ اپنے اس معمول پر کار بند رہے۔ یہاں تک کہ جب اپنے سلسلے کے مشائخین کی زیارت کی نیت سے ہندوستان کا تاریخی سفر فرمایا۔ تو اس میں بھی نماز باجماعت تکبیر اولیٰ کے ساتھ بطور خاص پیش نظر رہا۔ آپ کے اس وصف خاص کی بڑی شہرت ہے کہ آپ چالیس برس سے زائد نماز باجماعت تکبیر اولیٰ پر سختی کے ساتھ کار بند رہے۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کی آخری نماز مرض الموت کے عالم میں پڑھی وہ بھی نماز باجماعت تکبیر اولیٰ کے ساتھ۔ فالحمد لله تعالیٰ علیٰ ذلک۔

نماز فجر کے بعد جب مصافحہ فرماتے تو مصلیان مسجد جو خاص کر اساتذہ و طلبہ ہی ہوتے ان کو بڑی پابندی کے ساتھ یہ تلقین فرماتے۔  
 ”میاں نماز تو نماز۔ جماعت تو جماعت۔ بات تو جب ہے کہ تکبیر اولیٰ نہ چھوٹے یہی نماز اللہ سے ملا دیتی ہے۔“ آپ کی دوستی و دشمنی الحب فی اللہ و البغض فی اللہ کی روشنی میں ہوتی۔ اپنے ملنے والوں و اہل عقیدت و ارادت کو ہمیشہ یہ نصیحت فرماتے ”میاں کسی سے دوستی کرو تو اللہ کے لئے اور کسی سے دشمنی کرو تو اللہ کے لئے اس سے الگ رہ کر کچھ نہیں۔ ہر نماز پنجگانہ کے لئے آپ اس قدر اہتمام فرماتے کہ دوسرے لوگ عید بقر عید کی نماز کے وہ اہتمام نہ کر پاتے۔

آپ کی مسجد، مسجدیں تو دنیا میں ایک سے ایک بنیں، بنتی ہیں اور بنتی رہیں گی۔ اپنی شوکت و عظمت فن تعمیر کے اعتبار سے ایک سے بڑھ کر ایک۔ آپ نے بھی اپنی وسیع خانقاہ میں ایک مسجد بنائی، جو فن تعمیر اور ہیئت صوری کے اعتبار سے اسے غیر معمولی نہیں۔ البتہ جس عہد اور دیہات کے ماحول کے اعتبار سے اسے قابل ذکر کہا جاسکتا ہے۔

مگر اس کے لئے آپ نے جس خلوص بے پایاں، اہتمام بیکراں اور احترام فراوان کا مظاہرہ فرمایا۔ اسلامی تاریخ میں اس کی مثال کے لیے دور دور تک تلاش کرنا پڑے گا۔

اس مسجد کی خصوصیت یہ ہے کہ اپنی تمام تر زمین و آرائش کے ساتھ پہلی اینٹ سے لیکر آخری اینٹ تک نماز باجماعت تکبیر اولیٰ پر بنی ہے یہاں تک کہ اگر کسی دن مغرب کی اذان ہوگئی اور کام کرنے والے کارگر مینالے کی بلندیوں پر ہیں تو آپ تکبیر تحریمہ کے لیے اس وقت تک اللہ اکبر نہیں کہتے جب تک کارگر پیچھے کھڑے ہو کر کہہ نہیں دیتے کہ ہم حاضر ہو گئے ہیں۔ اور کارگر بھی کیسے؟ فاسق و فاجر نہیں؛ بلکہ متشرع اور پارح وقت کے نمازی۔ اور اگر اتفاقاً کسی دن کسی کارگر کی ایک رکعت بھی نماز باجماعت چھوٹ جاتی تو اس دن اس کارگر کو کام سے روک دیتے مگر دن بھر کی پوری ابرت عطا فرماتے فجزاۃ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

الذرت العزت کے گھر کی تعمیر میں حضرت شاہ صاحب نے جو زبردست احترام فرمایا اس کی جزا انھیں دینے والا رب جانے یا لینے والا جانے۔ مگر دنیا نے تو یہ دیکھا کہ ان کے عظیم الشان خوبصورت اولاد پر شکوہ روضے کی تعمیر ان کے مرید مخلص الحاج سیٹھ محمد یوسف و برادران رئیس نانپارہ (بہرائچ) نے اپنے جیب خاص سے کرایا تو اس بات کا خاص اہتمام فرمایا کہ ان کے روضے کی تعمیر بھی نماز باجماعت تکبیر اولیٰ پر ہو۔ روضے کی تعمیر میں ایک طویل عرصہ لگا لیکن کسی دن

اگر کسی کاریگر کی اتفاقاً جماعت کی ایک رکعت بھی چھوٹ جاتی تو الحاج سیٹھ محمد یوسف صاحب اس دن کاریگر کو کام کرنے سے روک دیتے مگر دن بھر کی پوری اجرت دیتے۔ اور یہ کہہ کر خوش ہوتے کہ جس نے خدا کے گھر کو اس قدر اہتمام و احترام کے ساتھ بنایا اس کے گھر کو بھی تقریباً اسی اہتمام کے ساتھ بنایا جائے گا۔

علوم دینیہ کی نشر و اشاعت سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ مدارس اسلامیہ کی ضرورت و اہمیت پر کافی زور دیتے ہوئے فرمایا۔

تعلیمی ادارے قائم کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ اول اس لیے کہ شریعت کے بغیر طریقت حاصل نہیں ہو سکتی۔ دوسرے اس لیے کہ انبیاء و مرسلین صرف نماز روزے اور اوراد و وظائف ہی کے لیے دنیا میں تشریف نہیں لائے بلکہ عبادات و اعمال کے ساتھ دینی تعلیمات کی اشاعت کے لیے بھی بھیجے گئے۔ نماز، روزے، اوراد و وظائف سے آدمی خود تو سنبھل سکتا ہے لیکن دوسروں کو سنبھالنے کے لیے علم کی ضرورت ہے۔“

اسی ضرورت کے تحت آپ نے اپنی خانقاہ میں دارالعلوم فیض الرسول کی بنیاد رکھی اور اپنی حیات ہی میں اسے پروان چڑھانے کی کامیاب جدوجہد کی۔

اسے اسلام و سنیت کی اشاعت و عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا ایک اہم مرکز بنایا۔ ان کے پسماندگان میں شہزادگان، اساتذہ اور ارباب بست و کشاد نے اپنے خون جگر سے اسے نقطہ عروج کا اعزاز بخشا۔ اور آج تو اس کے اجالوں سے ایک جہاں روشن ہے۔ پس

خداے بزرگ و برتران کے تربیت انور پر دن رات لگاتار رحمت و نور کی  
بارش برسائے سے

اے ارض براؤں تیری عظمت کے تصدق  
سینہ ترا آرام گہ یارِ حاکم ہے  
ہر ایک بلا دور ہوئی نام سے ان کے  
ہر ایک و بان کے تصور سے ملی ہے

# دیوتا کی شکتی

شدھی تحریک کو کچلنے کے لیے جماعت اہلسنت کے علماء و مشائخ دیوانہ وار آگے بڑھے اور بڑی پامردی و استقلال کے ساتھ طوفانِ بلاخیز کا رخ موڑ کر امت مسلمہ کو ایک تباہی سے بچا لیا۔

دسمبر کی سرد ترین رات کا پچھلا پہر، ہر سوسناٹا اور کہر کی دھند میں لپٹی ہوئی پھسکی چاندنی اپنڈت دیانند کو صبح بھور میں اٹھنے کی دیرینہ عادت تھی۔ کیا گرمی کیا جاڑا، اپنی عادت کے مطابق وہ صبح سویرے اٹھ کر رفع حاجت کے لئے نکل جاتا۔ روزانہ کی طرح وہ آج بھی ہاتھ میں لوٹالے ہوئے گاؤں سے باہر نکل کر وہ پیل کے اس تناور درخت کے نیچے سے گذر جانا چاہتا تھا جس کے نیچے سے وہ ہمیشہ گذر کرتا تھا۔ وہ بچپن سے سننا آیا تھا پیل کے مقدس درخت پر بھگوان براجمان ہوا کرتے ہیں۔ اس وہم کو وہ زندگی بھر اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ دن رات جب کبھی اس پیل کے درخت پر نظر پڑتی تو بڑی عقیدت کے ساتھ نظریں بچا کر ایک لمحہ کے لئے سر جھکا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیتا۔

روکھی پھیکي چاندني اور گهر کے دھند میں لپٹے ہوئے پیل کے درخت کے نیچے پنڈت دیانند کو ایک غیر معمولی بیوی نظر آیا۔ جسم کے سارے رنگے کھڑے ہو گئے۔ ڈرتے جھکتے۔ بشکل تمام چند قدم آگے بڑھا۔ بیوی نے کی صورت تھوڑی سی واضح ہوئی۔ پنڈت کی گھگھی بندھ گئی۔ غیر ارادی چیخ پر وہ قابو نہ پاسکا۔ خوف و دہشت سے اس کے جسم کے سارے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔

یوں تو جاڑے کی لمبی رات میں صبح تڑکے ہی نیند پوری ہو جایا کرتی ہے مگر کاہلی اور سستی سے لوگ لحافوں میں گھسے رہتے ہیں۔ پنڈت کی اضطرابی چیخ نے قریبی گھروں کے لوگوں کو بستر چھوڑنے پر مجبور کیا۔

کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کی آوازوں کے ساتھ ہر طرف سے لوگوں نے پنڈت کو گھیر لیا۔ کئی آدمیوں کے ساتھ ایک بار پھر پنڈت ہمت کر کے درخت کی طرف بڑھا۔ دھیرے دھیرے صبح کا اجالا پھیل رہا تھا پھیکي چاندني دم توڑ رہی تھی۔ پیل کے نیچے اتنا اجالا پھیل چکا تھا کہ چند قدم کے فاصلے سے لوگ واضح طور پر کچھ دیکھ سکیں۔

پنڈت اور اس کے ساتھیوں نے پیل کے نیچے جو کچھ دیکھا وہ ان کے حواس باختہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ مگر پنڈت نے بہت جلد اپنے حواس پر قابو پا لیا۔ تھیر تھیر مسرت کے عالم میں وہ گرتا پڑتا گاؤں کی طرف بھاگنے لگا۔ فوراً مسرت سے اس کی آواز کیکپا رہی تھی بھگوان آگئے۔ بھگوان آگئے۔ دیوتا جی نے اپنے پیارے پیارے چرنوں سے ہمارے بھومی کو پوتر کر دیا۔ صبح ہی صبح جس نے بھی پنڈت کی

اچھے پوچھا۔ دیوتا جی کہاں ہیں؟ کس کے یہاں؟  
 پیپل کے نیچے! پیپل کے نیچے! جلدی جاؤ۔ فوراً پہنچو! کی  
 صدالگاتا، ہانپتا، کانپتا، پھولتا پچکتا۔ کالی چرن کے گھر پہنچا۔  
 کالی چرن!..... او کالی چرن، ارے کالی چرن کے بچے جلدی

نکل!  
 کالی چرن آنکھیں ملتا ہوا حیرانی کے عالم میں باہر نکلا۔ اسے پنڈت  
 جی مہاراج! اتنے سویرے سویرے اور وہ بھی ہم جیسے آدمی کے گھر پر!  
 خیریت تو!

ارے دیوانے سب ”کشل منگل“ ہے میں تجھے آج سچا دھارمک  
 بنانے آیا ہوں۔ تو سب زیادہ میرا مذاق اڑایا کرتا تھا۔  
 کیسا مذاق اپنڈت جی!

بھول گئے میری ہزبات کو چکیوں میں اڑا دیتے ہو۔ خاص کرب  
 کبھی پیپل کے درخت کو سیس نوا کر پرنام کرتے دیکھ لیتے ہو تو اس دن  
 جینا دو بھر کر دیتے ہو۔ وہ تو میں پھر بھی کروں گا۔ بھلا پنڈت جی مہاراج!  
 یہ کوئی بات ہوئی جو تم کہتے ہو کہ پیپل کے درخت پر بھگوان بیٹھا کرتے  
 ہیں تو کیا بھگوان کو پدھارنے کے لئے پیپل ہی کا درخت ملا تھا۔  
 بھگوان کو پدھارنا ہی ہوگا تو آم، امرود، جامن، سیتا پھل وغیرہ کے  
 پٹیرے بیٹھیں گے جس پر پھل فروٹ میوہ مسٹھان ہوتا ہے نہ کہ پیپل کے اوپر  
 جو نہ زندے میں نہ مردے میں۔

کالی چرن کی چھتی ہوئی باتوں سے پنڈت کو طرارہ آگیا اور پیار  
 بھرے لہجے میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ارے نادان بالک! کیوں اپنے ایمان



ستیاناں کرتا ہے۔ چل آج تیری آنکھوں کی پٹی کھل جائے گی۔ بھگوان نے میری بنتی سن لی ہے۔ میری پتسیا کی لاج رکھ لی ہے۔ تمہیں جیسے نادان بالکوں کے ایمان بچانے اور تمہاری آنکھیں کھولنے کے لئے بھگوان نے اپنے سنگھاسن کو چھوڑ کر تم جیسے پاپیوں اور روشیوں کو پوتر اور زدوش بنانے کے لئے پیپل کے نیچے آنے کی کرپا کی ہے چلو اپنی بیل جیسی آنکھوں سے دیوتا کی شکتی کو دیکھ کر اپنا ایمان ٹھیک کر لو۔ پنڈت یہ کہہ کر ایک جھٹکے سے مڑا۔

کالی چرن بھی خیرانی کے عالم میں پنڈت کے پیچھے چلنے لگا۔ گلوں سے باہر نکل کر پیپل کے نیچے دیوتا کے گرد لوگوں کا ہجوم دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا۔

قد آور اور توانا جسم، ڈاڑھی اور مونچھوں سے بھرا ہوا بے حد دلکش چہرہ، ماتھے پر قشقہ، گلے میں پنڈن کی مالا۔ ایک پاؤں پر کھڑے، دونوں ہاتھ جوڑے سر جھکائے، آنکھیں بند کئے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے نیاز! شخصیت کی دلاویزی اور پروقاہ سر اپانے ہر ایک کو سحر زد کر دیا۔ آن کی آن میں یہ خبر جنگل کے آگ کی طرح اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ ہر چہار جانب سے انسانوں کے قافلے جھنڈ درجھنڈ آنا شروع ہو گئے۔ بدایوں کے مضافات میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دیوتا کی بھینٹ کے لئے ہر کوئی کچھ نہ کچھ لئے چلا آ رہا تھا۔ دودھ، مکھن، گھی، ملائی، لاوی، مٹھائی، پوڑی، سہاری غرض بوڑھے جوان، امیر و غریب، سب حسب توفیق اپنی عقیدتوں کی سوغات لے دیوتا کے حضور میں حاضر

ہو گئے۔ صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے تمام، مگر دیوتا کی ہیئت کذاتی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی ایک پاؤں پر ہاتھ جوڑے، سر جھکاتے، آنکھیں بند اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے نیاز! پھر رات آئی اور صبح بھی ہوئی اور دوپہر کا وقت بھی ہو گیا۔ مگر دیوتا اپنی ہیئت پر قائم رہا۔ لوگ اٹھ بیٹھ، کھاپی کر بے حال ہوتے جاتے تھے۔ مگر دیوتا پر ٹھنڈی گرمی، بھوک و پیاس اور تھکاوٹ کا کوئی اثر نہ تھا۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ لالہ گوپی ناتھ سے رہا نہ گیا۔ اس پاس کے آدمیوں سے پوچھنے لگا۔ بھائیو! دیوتا جی گوشت پوست کے بنے ہیں یا پتھر کے۔ نہ کھانا نہ پینا، نہ سردی نہ گرمی نہ تھکاوٹ ایک پاؤں پر آخر کب تک کھڑے رہیں گے؟

چپ رہے لالہ جی! آپ انھیں دیوتا بھی مانتے ہیں اور ایسے شبہ بھی منہ سے نکالتے ہیں۔ ارے دیوتا بھی اگر ہمارے اور آپ کی طرح دھان پان سے ہوں تو ہم میں اور دیوتا میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ اپنی اتم شکتی کی وجہ سے یہ بہمان ہوتے ہیں۔ ابھی تو صرف ایک رات اور ایک دن ہی ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں کب تک وہ یونہی اپنی دیا سے ہم دوشیوں اور مہا پاپیوں کے من کی کھوٹ کو اپنے شبہ درشن سے ڈھو کر ہماری بے اکل آتماؤں کا اپکار کریں گے؟ یہ اُن کی کرپا ہے کہ انھوں نے ہم تن کے اجلے من کے کالوں کو اپنا درشن دیا اور راج سنگھاسن کو چھوڑ کر ہم غریب داسیوں کے یہاں پدھارے۔ رام چندر نے لالہ جی کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ پھر لالہ جی سے سُرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ اچھا لالہ جی! ایک بات بتائیے کہ آپ نے اس سے پہلے بھی اتنا پیارا، اتنا سندر، اتنا من موہن مکھڑا دیکھا تھا؟ قسم بھگوان کی چندر ما بھی تو دیکھ کر شرماتا ہو گا۔

دیوتا کو ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے دوسرا دن بھی ختم ہو گیا۔ انسانوں کا ہجوم ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ پجاریوں اور پنڈتوں نے دیوتا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ بھجن اور ناقوس کی صداؤں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور پھر پوری رات بھی اس ہیئت کزائی پر ختم ہو گئی۔ کھانے پینے اور مختصر آرام کرنے کے بجائے پنڈتوں کی حالت ابتر ہو رہی تھی، چڑھاؤں اور نذرانوں کی لالچ اور دیوتا کے تقدس نے ان کے پاؤں میں زنجیریں ڈال رکھی تھیں، وہ گرگڑا رہے تھے۔ ہمارا ج! آنکھیں کھول دیں۔ اپنے داس داسیوں اور سیوکوں پر ایک نظر ڈال کر ان کے ہر دے کو شانت کر دیں۔

تیسرے دن کا سورج جب دوپہر کی مسافت طے کرنے کے قریب پہنچا تو دیوتا نے آنکھیں کھولی۔ سُرخ اور بڑی بڑی آنکھیں جن میں سُرخ سُرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔ پجاری کپکپا اٹھے۔ ان کے سارے وجود میں وہ آنکھیں دھستی محسوس ہوئی۔ مجال نہیں کہ دیوتا سے آنکھیں ملا لیتے۔ بس آنکھ پیچی کئے ہوئے گرم دودھ کا پیالہ دیا۔ پے درپے کئی پیالے پینے کے بعد دیوتا نے آسودہ سی ڈکار لی۔ اور آہستگی کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔

بھگوان نے آنکھیں کھول دیں۔ دیوتا جی زمین پر بیٹھ گئے۔ یہ خبر سارے مجمع میں پھیل گئی۔ انسانوں کے اس سیلاب میں نے سر سے پھر پھیل چم گئی۔ جی بھر کر دیوتا کو دیکھنے کے لئے لوگ ٹوٹ پڑے تھے۔ پنڈت اور پجاری بھیڑ کو دیوتا سے دور رکھنے کے لیے سارا زور ختم کئے رہے تھے۔ مگر ان جنم جنم کے پیاسوں کے آگے ان کی ایک

چلی۔ آدمیوں کے ریلے میں پنڈتوں کی حیثیت چند تنکوں سے زیادہ نہ تھی۔ چیخ و پکار اور شور و شہار سے ایک قیامت مچی ہوئی تھی۔ دیوتا کو ان پنڈتوں کی حالت زار پر رحم آ ہی گیا۔ واضح طور پر دیکھ لیا کہ عوام کے بتیابی شوق پر کنٹرول کرنا پجاریوں کی سکت سے باہر ہے۔ بڑے ہی پر وقار، پاٹ دار اور گنگھیرتا کے ساتھ لوگوں کو مخاطب کیا۔

میرے بچو! شانتی اور دھیرج!

میں تمہارے بیچ اتنی سے ضرور پدھاروں گا جس سے تمہارے منوں کی بیا کل کامنائیں شانت ہو جائیں۔

زندگی میں پہلی بار جن جن شوکھے کانوں تک دیوتا کی شہد بھری آواز پہنچی۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ سمجھوں نے فرط عقیدت سے دیوتا کے احترام میں مہر بہ لب ہو کر اپنی اپنی گردنیں جھکا دیں اور چند قدم خود ہی سے دور ہٹ کر چاروں طرف سے دیوتا کو گھیر لیا اور والہانہ انداز میں ایک تک دیوتا کو دیکھنے لگے۔ اتنے بھاری بھر کم وجود کو اگر آنکھوں کے راستے دل میں اتار لینا ممکن ہوتا تو کب کا دیوتا کو اپنے دل کی خوشگوار دھڑکنوں میں سمو کر اپنی خیمت زدہ تمناؤں کو شاد کام کر چکے ہوتے۔ ہر ایک اپنے من کی آنگن میں دیوتا کو ننگے پاؤں چلانے کا آرزو مند تھا گو یا زبان حال سے کہہ رہا تھا

دل کے آنگن میں خرام ناز سے آجائے

پروانوں کے ہجوم میں دیوتا جی آسن جمائے بیٹھے تھے کہ اچانک

اسی درمیان گاؤں کی مسجد سے اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائے

زمزمہ نواز بلند ہوئی۔ سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی آواز! دیوتا کے

گرد پہلے ہی خوشی طاری تھی۔ اس صدائے پرسوز نے ایک استقامت  
 مسلط کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اللہ اکبر کی اس صدک نے فضا کے صدا  
 کی لہر شہین لیا ہو۔ خود دیوتا کے رُونگے کھڑے ہو گئے ہیں اور  
 ایک محویت کا عالم طاری تھا۔ جب صدائے سامعہ نواز ختم ہوئی تو  
 دیوتانے بڑی حیرت سے پوچھا۔

» اسی کاؤ ہووت ہے ؟ « (یہ کیا ہو رہا ہے ؟)

پجاریوں نے بڑے ادب کے ساتھ جواب دیا۔ » ہمارا ج !  
 اسی مسلمان لوگن کے اجان ہووت ہے « (مسلمانوں کی اذان سے  
 ہو رہی ہے)

تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی اور دیوتا جی گیان جی  
 میں بیٹھ گئے کہ پھر وہی ساز حیات کو تھرا دینے والی آواز ابھری۔  
 دیوتا جی نے گہرا کر پوچھا : » اب کاؤ ہووت ہے ؟ « (اب کیا  
 ہو رہا ہے ؟)

ہمارا ج ! آج مسلمان لوگن کے جمیہ کا دن ہے۔ جمعہ کے  
 دن یہ دوبار اجان دیوت میں۔ جب لوگن جٹ جاوت ہیں تو پھر  
 اجان دیوت میں اور ان کا مولوی کتاب پڑھت ہے تو اب کی یہ  
 اجان کتاب پڑھ کے لئے بھئی ہے۔ کتاب پڑھ کے بعد نماج  
 پڑھت ہیں۔

نماج کاؤ ؟

ایشور کی پرار تھنا ! بھگوان کی پوجا !  
 یہ سنتے ہی دیوتا، ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا کہ چلو مسلمانو

کی پرارتھنا بھی دیکھ لیوں۔ آگے آگے دیوتا مہاراج اور پیچھے پیچھے انسانوں کا سیلاب مسجد کی طرف دیوتا کو والہانہ انداز میں جاتا دیکھ کر انسانوں میں نئے بہرے سے ایک بار پھر ہلچل مچ گئی اور ان کی آن میں وسیع و عریض مسجد کے سامنے آدمیوں کا ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا۔

مسجد کے سامنے ہندوؤں کے اس عظیم اجتماع پر، وہ بھی عین نماز کے وقت، مسلمانوں میں خوف و تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ امام مسجد نے صورت حال کی نزاکت دیکھ کر ایک مختصر اور پر جوش تقریر کے ذریعہ مسلمانوں کی گھبراہٹ دور کر کے ان کے خون میں حرارت کی تازہ لہر دوڑادی۔ پھر نماز شروع ہوئی۔ بخیہ و خوبی ختم بھی ہوئی۔ اس درمیان مسلمانوں کی عبادت کے طور و طریقوں نے دیوتا کو بہت متاثر کیا۔ بڑے خاموشی اور محویت کے عالم میں دیوتا جی مسلمانوں کو نماز پڑھتا دیکھتے رہے۔ نماز کے دوران ان کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب سی چمک پیدا ہوتی رہی۔ نماز کے بعد مسلمان یکے بعد دیگرے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسجد سے باہر نکلنا شروع ہوئے کہ اسی وقت درآن طور پر دیوتا مسجد کے صحن میں گھستا چلا گیا۔ دیوتا جی کو مسجد میں بے تابانہ گفتے دیکھ کر ہندو مسلمان سب حیران رہ گئے۔ ابھی ان کی حیرت کا ظلم ٹوٹنے بھی نہ پایا تھا کہ دیوتا نے امام صاحب سے کہنا شروع کیا: "مہاراج! بھگوان کی یہ پرارتھنا جو آپ لوگ کرتے رہیں ہم کا بہت بھائی بھگوان کے پوجے کا یہ ڈھنگ بہت اٹوٹا ہے۔ شریہ کا ہر ہر انگ ایشور کے آگے اس جھکت اور ماتھا ٹیکت بہت بھلا جان پڑت ہے۔ ایشور کے پوجے کا یہ اُپائے ہم کاں بھی بتائے دیا جائے۔ ہر دے میں سمائے گوا!"

دیوتا کی باتیں سن کر امام صاحب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جذبات سے بھرائی آواز میں جواب دیا۔ سو امی جی ہم آپ اور آپ کے ساتھیوں کا کھلے دل سے سواگت کرتے ہیں اور اس بات سے ہمارے جسم کا رُواں رُواں جھوم اٹھا کہ بالآخر سچے دین کی کشش نے آپ جیسے رشی مہنی کو بھی خدا جانے تک کھینچ لایا۔ دیر میں جانے کی بجائے حرم کی طرف اپنے رُخ کیا۔ لیکن اس انوکھی عبادت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پاک صاف ہو کر سچے دل سے صرف ایک خدا اور اس کے آخری رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (جن کا ذکر ویدوں، پرالوں، سنسکرت کے اشلو کوں اور اپدیشوں اور ہندو دھرم کے مہا پرشوں، بڑے بڑے رشی مہنیوں کے ان کہنیوں میں موجود ہے۔ تورات، انجیل زبور، ودیگر آسمانی صحیفوں میں جنکی آمد کی بشارت اور ان کی واضح نشانیاں بتا دی گئی ہیں) پر ایمان لاکر زبان سے کلمہ طیبہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ پڑھ کر پورے عملی و اعتقادی نظام کو قبول کرے تاکہ وہ اسلامی برادری میں داخل ہو کر خدا کی بندگی بجائے۔

تو آپ جلدی سے پاک و صاف کر کے مجھے اسلام میں داخل کریں نا !!!

خدا کو اسی طرح سے پوجنے کے لئے میں بہت بیاکل ہوں۔ دیوتا اور امام صاحب کی اس گفتگو سے لوگ ذم بخود تھے۔ خصوصاً پنڈت حضرات ایک نئی افناد کا سامنا کر رہے تھے۔ اب تک وہ کچھ نہ کچھ طوفان اٹھا چکے ہوتے۔ ہر دور میں فرقہ پرستوں اور مذہبی جنونیوں کی کوئی کمی نہیں رہی مگر دیوتا کی اتم شکتی کو وہ اپنے ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ

چلے تھے۔ دیوتا کی سحر طراز شخصیت اور اس کے وقار کا جبروت، نیز عوام کے جذبہ شوق کی نمود نے انھیں اور جو اس باختہ کر رکھا تھا۔ بالآخر دیوتا کے شدید اور پیہم اصرار پر امام صاحب نے حسب معمول کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دولت لازوال سے دیوتا جی کو سرفراز فرمایا۔ دیوتا کے مسلمان ہوتے ہی اسلام لانے والوں کا تانا باندھ گیا۔ شام ہوتے ہوتے سیکڑوں افراد دیوتا کے اتباع میں کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ جس نے جہاں بھی یہ حیران کن خبر سنی تصدیق کے لئے بھاگا چلا آیا۔ پھر دیوتا کے اسلام لانے کی برکت یہ ہوئی کہ ہزار ہا ہزار لوگوں کو حق و صداقت اور یقین کے اجالوں میں اسلام کا کلمہ طیبہ نصیب ہوا فالحمد لله على نعمائه الكا  
شہی تحریک کے دور عروج میں حضرت مولانا قطب الدین برہنچاری علیہ الرحمۃ (عم محترم امام النحو شیخ المنطق شارح بخاری صدر العلماء حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمۃ والرضوان) نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ علوم اسلامیہ کی فراغت سے ایک سال پہلے ہی بندوانہ وضع قطع اختیار کر کے بنارس کے سب سے بڑے مندر میں ایک دنیا بیزار پجاری کے حیثیت سے داخل ہوئے۔ مندر کے عملے سے جلد ہی دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ غنفوان شباب میں شخصیت کی دلاوری، مردانہ حسن و جمال اور پروقار سراپائے حسب نسب کے معاملے کو بڑی آسانی سے طے کر دیا۔ او دیکھتے ہی دیکھتے پنڈتوں اور پجاریوں کے نور نظر ہو گئے۔ حصول علم کی سچی تڑپ اور حسن خدمات نے پجاریوں اور پنڈتوں کو جلد مسح کر لیا۔ انھیں پجاریوں اور بے حد قابل پنڈتوں سے آپ نے چھوٹی سے لیکر بڑی بڑی کتابیں پڑھنا شروع کیں مسلسل تین برس تک کڑی محنت اور جانفشانی سے ویدانتوں اور پرانوں اور شاستروں پر عبور حاصل



کیا۔ اپنے سینے کو ہندو دھرم کے عجائب و اسرار، حقائق و معلومات کا خزانہ بنا کر مندر سے باہر تشریف لائے۔ علماء و مشائخ کی عام روش سے الگ ہٹ کر آپ نے اسلام کی تبلیغ کے لیے ایک نیا میدان منتخب کیا اور اس میدان میں آپ بے حد کامیاب رہے۔ اسلام پر خارجی حملوں کے دفاع میں آپ ایک مضبوط اور ناقابلِ تسخیر چٹان ثابت ہوئے۔ ہندو پنڈتوں، شکر آچاریوں، آریہ سماجوں سے کامیاب مناظرے گئے۔ مخالف اپنے دھرم پر آپ کی وسعت معلومات دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتا۔ انھیں کی مذہبی کتابوں سے اسلام کی حقانیت کو ایسا آشکارا کرتے کہ مذاہب کی تاریک وادیوں میں بھٹکنے والے مسافروں کی آنکھیں کھل جاتی تھی و صداقت کی مشعل دیکھ کر ہزار ہا ہندو آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام لائے سیکڑوں ہزاروں مرتد ہو کر پھر سے خدا کا کلمہ نصیب ہوا۔

شدھی تحریک نے جب آپ کے عہد میں زور پکڑا تو اس کے لیے آپ نے کمر پیمت کسی۔ اپنے پیرو مشد قطب المشائخ حضرت مولانا سید علی حسین اشرفی جیلانی استاذ الکل حضرت علامہ سید نعیم الدین مراد آبادی کے حکم پر ملک کے طول و عرض بالخصوص صوبہ یوپی کا طوفانی دورہ شروع کیا۔ سیکڑوں ہزاروں غیر مسلموں کو خلقہ بگوش اسلام کیا۔

ارتداد کے اس تیز و تند لہر میں سنا کہ بدایوں یا باندہ کے اطراف میں مسلمان شردھانند کے فتنے شدھی کا شکار ہو رہے ہیں اور دو ایک مسلمان مرتد بھی ہو گئے ہیں۔ اس خبر وحشت اثر نے آپ

کو تڑپا دیا۔ فوراً اپنے ایک شاگرد کو لے کر اس مقام کے لئے روانہ ہو گئے۔ گاڑی سے اتر کر اسٹیشن کے ایک گوشے میں جا کر اپنا مخصوص مشائخانہ لباس اتار کر یہ تاکید کی کہ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں یہیں رک کر میرا انتظار کرنا۔ اس کے بعد آپ نے شام کے دھند لگے میں بھیس بدلا۔ پورے جسم میں بھبھوت ملا۔ ماتھے پر قشقہ گلے میں چندن کی کالا ڈالی۔ ایک دیوتا کا روپ دھارن کیا۔ پھر اس دیوتا کے چیتکار نے ایک مسلمان کے بدلے میں سیکڑوں ہزاروں غیر مسلموں کو اسلامی برادری میں داخل کیا۔ وہ بدنصیب جو شر دھانند کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو گئے تھے اسلام کی دولت سے وہ بھی شرفیاب ہو گئے۔

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے یعنی ۱۹۲۳ء میں ”شدھی سنگٹھن“ تحریک کا آغاز ہوا۔ منصوبہ بند طریقے پر مسلمانوں کو قتل مرتد اور اقتصادی و معاشی طور پر مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی ہم شروع ہوئی تاکہ برصغیر سے ان کے وجود کو پاک کر دیا جائے۔ یا اگر رہیں تو اس حال میں کہ خود ان کا وجود ان کے لئے ایک مستقل سوہان روح بنا رہے۔ آپہیں آنسو سسکیاں کراہیں ان کا مقدر بن جائے۔ اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھنے والے چند سجد متعصب فرقہ پرست جنونیوں نے ہندوؤں، بودھوں، اور سکھوں کے تعاون سے ایک عظیم تر ہندو قومیت کی بنیاد رکھنے کے لئے مسلمانوں کے خلاف ایک خوفناک سازش کی۔ پنڈت دیانند سوسوتی بانی آریہ سماج نے اس عظیم فتنے کو جنم دیا۔ وہی پنڈت دیانند جس نے سیتا رتھ پرکاش

نامی بدنام زمانہ کتاب لکھی۔ جس میں اس نے اسلام اور بانی اسلام  
 صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اپنے دل کے پھپھولے نکالے  
 بڑے ہی دلاڑمیرائے میں محسن انسانیت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
 کی بارگاہِ عظمت پناہ میں گستاخیاں کیں اور یہودہ الزامات سے اپنے  
 دامن کو دفاع دار کیا۔ جس کا مسکت، مدلل اور دندان شکن جواب  
 صدر الافاضل فخر الاماثل حضرت علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی  
 علیہ الرحمہ نے بڑی تحقیق و تفصیل سے دیا۔ جو موقر جریدہ پندرہ روزہ  
 ”السواد الاعظم“ میں برابر شائع ہوتا رہا ہے۔

تحریکِ خِلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ ترکِ گائیکشی کی  
 ہلاکت آفرینیوں کے بعد تحریکِ شدھی سنگٹھن کا فتنہ بڑی شدت کے  
 ساتھ رونما ہوا۔ جس نے اسلامیانِ ہند کو جھوڑ کر رکھ دیا۔ شروع  
 شروع میں وہ فتنہ ایک آندھی کی شکل میں رونما ہوا۔ دیکھتے دیکھتے  
 طوفان بن گیا اور پھر ۱۹۲۵ء میں دیانند کے صد سالہ تقریب کے  
 موقع پر ہندوستان کے گوشے گوشے سے فرقہ پرست مذہبی جنونیوں  
 کے اجتماع نے اسے بگولے کی شکل دیدی۔ پھر وہیں سے ہندوستانی  
 مسلمانوں کی اقتصادی تباہی، معاشی بد حالی، مذہبی زبوں حالی اور  
 ایمان کی تباہی کا ایک ہلاکت نیر دور شروع ہوا۔ صوبہ یوپی خصوصاً  
 اس تباہی کے لپیٹ میں آیا۔ لٹت پھسکت کے ساتھ ہی ساتھ  
 ہزاروں لاکھوں مسلمان مرتد ہوئے۔ العیاذ باللہ العظیم  
 یوں تو اس تحریک میں جو ناپاک تحریک تھی حصہ لینا۔ ہر  
 متعصب، فسادی، فرقہ پرست غیر مسلم اپنا فریضہ سمجھتا تھا۔ پندرتوں

کے ورغلانے پر بڑے بڑے ہندو بہاجنوں، ساہوکاروں اور بیوں نے اس تحریک کے لیے اپنی تجویروں کے منہ کھول دیئے تھے۔ مگر جس انداز میں سرگرمی پنڈت کالی چرن، رام چندرا، لالہ منشی رام، شردھانند دھرم بھکشو لکھوٹی، لالہ گوپی ناتھ امر وہی نے دکھائی یہ صرف انھیں کا حصہ ہے۔

شردھانند نے تو ایسی تیزی کا مظاہرہ کیا کہ خود دیا نند اس کے پیچھے رہ گیا۔ اس نے اس تحریک کو اوڑھنا، چھونا بنا لیا۔ اور اس کے پیچھے اتنی مستعدی سے پڑا کہ شردھانند اور شدھی تحریک ایک وجود کے دو نام ہو کر رہ گئے۔

یہ شخص مشرقی پنجاب کا رہنے والا تھا۔ تحریک ترک موالات (جو دراصل ہندوؤں کی تحریک تھی) اس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ جامع مسجد کے منبر پر بیٹھ کر محمد علی جوہر کے ساتھ ترک موالات کی حمایت میں زور دار تقریر کی۔ لیکن ۱۹۲۳ء میں مسلمانوں کی مصنوعی ہمدردی کا چولہ اتار کر پھینکا اور کل شئی ریرجج ائی اصلہ۔ کے مطابق اپنی اصلیت پر آگیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جب یہ کھل کر سامنے آیا تو اس کے روپ کے یہ غدو خال ملاحظہ ہوں :-

۱۔ شدھی تحریک کا اصل رُوح رُواں جس کا مقصد ہندوستانی نسل کے مسلمانوں کو مرتد بنانا تھا۔

۲۔ تحریک سنگٹھن میں نمایاں حصہ لیا جس کا مقصد ہندوؤں کے سکھوں اور بودھوں کے تعاون سے ہندوستان سے مسلمانوں

کو نکال کر عظیم تر ہندو قومیت کی بنیاد رکھنا تھا۔

۳۔ دہلی سے اخبار ”تیج“ نکالا جس میں ایسے مضامین شائع کئے جس میں اسلام اور مسلمانوں پر حملے کئے۔ (اور تیج ویکی دہلی کا آج بھی یہی دستور ہے)

۴۔ اس کے بیٹے نے ہندی زبان میں ایک اخبار ”ارتھن“ نکالا جس کا مقصد سلاطین اسلام کے کردار کو غلط رنگ میں پیش کر کے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کرنا تھا۔

۵۔ اس کے ایما پر ایک اخبار ”گر و گھنٹال“ جاری کیا گیا جس کا مقصد وحید مسلمانوں کی مقدس بستیوں پر ناپاک حملے کرنا تھا۔

۶۔ اس کے ایک چیلے نے جڑت نامی ایک کتاب لکھی جس میں پیغمبر اسلام و دیگر انبیاء نے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی سخت توہین کی گئی۔

۷۔ اس نے منگل شہزادیوں کے خلاف ڈرامہ اور ناول لکھنے کی ایک تحریک شروع کی اور اس سلسلے میں کئی ناول اور ڈرامے منظر عام پر آئے۔

غرض وہ زندگی بھر اسلام اور مسلمان دشمنی کا سب سے بڑا اعلیٰ درجہ رہا۔ رات دن وہ اسلام اور مسلمانوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا رہا۔ مسلمانوں کو مستانے میں وہ راحت محسوس کرتا۔ اس کی آئے دن نئی نئی خباثتوں اور دلازاروں سے مسلمان تنگ آگئے تھے۔ ان ہی سببے ہو دیگوں اور ہرزہ سرائیوں کی بنا پر دہلی کے ایک غیرتمند مسلمان قاضی عبدالرشید نے ۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء میں شردھانند کو قتل

کر کے جہنم رسید کیا اور خود نتیجہ ۱۹۲۷ء میں جہاں شہادت نوش کیا۔  
(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) (بحوالہ تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم ص ۳۶۰)

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد از عشق  
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما  
وقت کی بید خطرناک شدھی تحریک نے برصغیر کے مسلمانوں کو ہلاک  
رکھ دیا۔ اس تحریک میں مجموعی طور پر ساڑھے چار لاکھ مسلمان مرتد ہوئے۔  
لٹت پھکت فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و غارت گری کا تو کوئی  
ریکارڈ ہی نہیں۔

اس خطرناک تحریک کو کچلنے اور اس کی ہلاکت آفرینیوں سے  
امت مرحومہ کو بچانے کے لیے سواد اعظم اہلسنت و جماعت کے علماء و  
مشائخ پیران عظام دیوانہ وار آگے بڑھے اور بڑی پامردی اور استقلال  
کے ساتھ اس طوفانِ بلاخیز کا رخ موڑ کر امت مسلمہ کو ایک بڑی  
تباہی سے بچالیا۔ اس خصوص میں جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی  
جماعت اشرفیہ حلقہ اشاعت الحق اور انجمن خدام الصوفیہ نے تاریخ  
ساز کردار ادا کئے۔

صدر الافاضل حضرت مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی،  
تجہ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خان بریلوی، مفتی اعظم ہند حضرت  
مولانا مصطفیٰ رضا خاں صاحب، حضرت مولانا پیر سید جماعت علی  
شاہ محدث علی پوری، تاج العلماء حضرت مولانا محمد عمر نعیمی، شیخ  
المشائخ حضرت پیر سید علی حسین اشرفی، مبلغ اسلام حضرت مولانا  
شاہ عبد العظیم صدیقی میرٹھی، حضرت مولانا مفتی احمد صدیقی میرٹھی،

حضرت مولانا ابوالبرکات سید احمد صاحب، حضرت مولانا نثار احمد صاحب کانپوری، حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب، حضرت مولانا سید قطب الدین برہمچاری، مولانا غلام عبدالقادر اشرفی، حضرت میر غلام بھیک نیرنگ انبالوی وغیرہ نے حیران کن کارنامے انجام دیئے ان نفوس قدسیہ نے اس زبردست فتنے کو مکمل طور پر کچلنے کے لئے اپنے آپ کو بڑی بڑی آزمائشوں میں ڈالا۔ ان بزرگوں نے اس کے مکمل استیصال کے لئے ملک میں طوفانی دورے کئے سیکڑوں مبلغ میدان ارتداد میں اتار دیئے اور اپنے جیب خاص سے بیسٹھار روپے خرچ کر کے اسلام اور مسلمانوں کی لاج رکھ لی۔ فاضل مراد آبادی اور محدث علی پوری علیہما الرحمۃ نے تو آگرہ کو ایک طویل عرصے تک ہیڈ کوارٹر بنا کر مہتمم، بھرت پور، گوبند گڑھ، جے پور کشن گڑھ اور اجمیر شریف کے اطراف و جوانب میں مسلسل دورے کئے اور مبلغین بھیجے، براہ راست اس فتنے کو کچلنے کے لئے اور بھی متعدد طریقے اختیار کئے گئے۔

۱۔ وید حکیم کا بھیس بدل کر ۲۔ معالج حیوانات کا بہروپ بھر کے۔  
 ۳۔ سادھوؤں کا روپ دھارن کر کے ۴۔ گویوں کا بھیس بدل کر۔  
 غرض جہاں جیسی ضرورت محسوس کی گئی۔ مسلمانوں کو بچانے کے لئے ویسا ہی حربہ استعمال کیا گیا۔

ان نفوس قدسیہ کی سرفروشی اور مجاہدانہ کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساڑھے چار لاکھ مرتدین کو پھر اسلام کا کلمہ نصیب ہوا۔ اور ڈیڑھ لاکھ غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ بھیس بدل کر جو کوششیں ہوئیں سکی

و جب سے پچاس ہزار ہندو مسلمان ہوئے۔ اسلام لانے کے بعد جو سند  
جاری کی جاتی اس کے چار حصے ہوتے ایک حصہ اس نو مسلم کو دیا جاتا  
دوسرا حصہ صدر دفتر بھیجا جاتا۔ تیسرا حصہ ریکارڈ میں رکھا جاتا اور  
چوتھے پر نو مسلم کی چوٹی کاٹ کر لگائی جاتی۔

اسلام کی اشاعت میں صرف یہ حصہ اہلسنت کا ہے جن کے  
سرخیل قائد اور امام برصغیر کے مشہور عاشق رسول اعلیٰ حضرت امام  
احمد رضا بریلوی ہیں، جبکہ جمعیتہ العلمانی ملاؤں، وہابی ازمام کے  
علمبرداروں، وقت کے شیخ الہندوں، شیخ الاسلاموں، امام  
الہندوں اور ان کی ذریات کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ رُوزِ اول  
ہی سے بیظالم توحید کا زبانی ٹھیکہ دار بنائے اور شرک و بدعت کے  
سپنے میں ایسے مبتلا ہیں کہ انھیں کچھ کرنے کی نہ کل کچھ فرصت تھی اور  
نہ آج۔ بنام اسلام سی آئی اے کے روپے نے زمین دوز تباہ کاری  
اسلام کا ایک طویل عرصہ تک سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ اُن کے اکابر  
نے وطن اور ملت فروشی کے ذریعے انگریزوں سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ اور  
ان ظالموں نے چند غلاظت کے بوتھروں کی خاطر اندر ہی اندر فروت  
پرستوں سے پیٹھ ملا لیا۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ایسے تاریک ایام، ہوشربا  
ماحول اور ہلاکت خیز دور میں تاریخ کے اجزائے پریشاں میں ان سے  
پردہ نشینوں کا دور دور تک نام نہیں۔ غیر ملکی سرمایہ کی فراوانی اور  
پیس و قلم کی توانائی کی بدولت ذرائع ابلاغ پر تہہ اجارہ داری نیز  
غلط بیہودہ اور لائینی صحافت نے بردلوں کو شیر دل، وطن فروشوں کو  
وطن پرست اور چڑھتے سورج کے پجاریوں کو مجاہدین صاف شکن بنا دیا



۱۲۲  
 ہے۔ اس افسوسناک جعلی اور بقلم خود تاریخ نے دین فروشوں کو سرفروش  
 اور حالت کی ستم ظریفی نے ایمان کے ڈاکوؤں کو اسلام کا سب سے بڑا غازی  
 مجاہد اور شہید بنا دیا ہے۔

ہائے رے گردش ایام کل تک وہ لوگ جو وطن فروشی اور ملت  
 کی نیلامی کا سٹہ لگاتے تھے، آج وہی اسلام کے سب سے بڑے  
 علمبردار اور وطن کے پاسبان کا بہروپ بھرے تاریخ پر قبضہ جمائے  
 بیٹھے ہیں۔

اشاعتی اور صحافتی محاذ پر سواد اعظم اہلسنت و جماعت کے  
 بے بسی، ہستی، تن آسانی، باہمی قد کی پیمائش، افسوسناک  
 توافل اور مجرمانہ سکوت نے آج وہ دن دکھایا ہے کہ اندھیرا جلال بن گیا اور  
 ہے اور رات کو دن کی جگہ مل گئی ہے۔ ہماری غفلت شعاریوں اور  
 مجرمانہ کوتاہیوں کی وجہ سے تاریخ کے وہ کچھ جہاں صرف شیروں کی  
 دباؤ سنائی دیتی تھیں۔ آج وہی زراع و زعن کی کائیں کائیں اور  
 گدڑوں لومڑیوں کی کوکو اور مہنکا ہنواں سے بارِ سماعت بنے ہوئے  
 ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری  
 خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری  
 تحریک شدھی میں بری طرح سے ناکامی کے بعد فرقہ پرستوں  
 امن دشمنوں اور متعصب ہندوؤں نے مسلمانوں کی دلازاری کا  
 باقاعدہ تحریری سلسلہ شروع کیا جس کی شہادت میں آریہ سماج  
 کی ان کتابوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ترک اسلام، تہذیب الاسلام، سیتارہ پرکاش، آریہ تیرہ بی  
آریہ مسافر جالندھر، آریہ مسافر میگزین وغیرہ وغیرہ۔

غیرت مند مسلمانوں نے بڑی اولوالعزمی اور سرفروشی کیساتھ  
ان گستاخان رسول کا محاسبہ کیا۔ چنانچہ بارگاہ رسول کے مشہور گستاخ  
راجپال کو غازی علیم الدین نے اس کی دوکان میں دن دہائے نوکروں  
کی موجودگی میں گھس کر اس دشمن اسلام کو نعت کر دیا۔ اس کے بعد عشق  
رسول میں مست ہو کر مسکراتے ہوئے پھانسی کے پھندے کو چوم لیا۔ ۲۵  
لاکھ مسلمانوں نے عقیدت و احترام کے آنسوؤں کے ساتھ انھیں سپرد  
خاک کیا۔ ایسے عاشق کی نماز جنازہ کے لئے ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے دیدہ و  
نے سید محدث دیدار علی ملیڈر رشید اعلیٰ حضرت بریلوی کو صحیح حقدار قرار دیا  
لیکن انسانی سیلاب کے اس ریلے میں حضرت اپنی تمام تر کوششوں کے  
باوجود بجائے نماز تک نہیں پہنچ سکے۔ کافی انتظار کے بعد کہیں دوسرے  
خوش نصیب کے حصے میں یہ سعادت آئی۔ عاشق کا جنازہ بے ذرا دھوم سے نکلے۔  
سردھانند لعین کوہلی کے ایک غیر تہذیبی نوجوان قاضی عبدالرحیم نے جہنم  
رسید کے اسکی مستقل اذیت سانیوں اور دلازاروں سے مسلمانوں کو نجات دلائی  
بھولانا تھ خبیث کو امیر احمد اور عبداللہ نام کے نوجوانوں نے ٹھیک کیا۔  
قصور کے پالامل کو محمد صدیق نامی ایک نوجوان اور کراچی کے تھوڑا م کو  
غازی عبدالقیوم نے کیفر کر دیا۔ پچاس خدارتت کندایں شقان پاپینت ا  
اللہ ان سے راضی ہوا اور یہ اللہ سے راضی ہوئے سے

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے  
اتنا ہی وہ ابھرے گا جتنا کہ دباؤ گے

# جلوہ رنگین کی تمنا

روایتی قصے کہانیوں کی طرح کرامہ بنت عمرو بن عبد المسیح بن قیس بن حارث بقیلہ کے حسن جہاں سوز کا شہرہ عراق کے مشہور شہر حیرہ کے مرغزاروں سے نکل کر عرب کے ریگزاروں تک پھیل چکا تھا۔

مہوشوں، لالہ رخوں، سرودوں، سیسے تلوں، گل بدوں میں اس کے ناز و انداز، دلبری و دلربائی، دلکشی و رعنائی، حسن ادا اور بانگین کا آوازہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

تم چاندنی ہو، پھول ہو، نغمہ ہو، شعر ہو

الذکرے حسن ذوق میرے انتخاب کا

حسرت دید کے تماشے لئے دیوان گان کو چہ یار اس گلی کا طواف کرتے ہوئے نہیں تھکتے کہ جلوہ بے تاب کی ایک جھلک ہی سہی! جلتی آنکھوں کے لئے کچھ تو سامان تسکین فراہم ہو سے

تمھاری دید ہی مقصد رہا ہو جن نگاہوں کا

وہ چشم منتظر پتھر اگیں کیا تم نہ آؤ گے

دلبری و دلربائی کے ساتھ خرام ناز کا محشر، جانے کتنے دلوں کو زیر و زبر کر جاتا، اداے جانانہ کے ساتھ بہانے ناز کا تبسم، دلوں کے آنگن میں موسم گل کا سماں باندھ دیتا ہے

وہ جب آئے گا تو اس کی رفاقت کے لئے  
 موسم گل میرے آنگن میں اتر آئے گا  
 اور جب کبھی نرگس مست ناز گیا آلود انداز لے اپنے پلکوں کی چلن کو نیچے  
 سے اوپر کرتی تو مشتاقانِ دید کی آنکھوں میں امید کی جلنے کتنی ہمیں  
 جلنے لگتیں ہے

نرگس ہے چشم، سرو ہے تدا گل خدا ہے  
 نام خدا وہ شوخ سراپا بہار ہے

سید العرب والعجم آقائے کائنات فرمودات حضور رحمت عالم نور مجسم  
 سرور عالم جناب احمد انجبتی محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حیات  
 ظاہری سے پردہ فرمانے کے بعد۔ افضل البشر بعد الانبیاء حضرت سیدنا  
 ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
 کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی قیادت آپ کے ہاتھوں  
 میں آئی۔

اپنی دو سالہ خلافت راشدہ کے ذریعے دور میں ایمانی جرات  
 اور بے پناہ عزیمت و استقامت کا جو عظیم الشان مظاہرہ آپ نے فرمایا  
 عقل و تاریخ انسانی دونوں آج تک حیران ہیں۔ حالانکہ آپ اس وقت  
 عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکے تھے۔ جہاں عام طور پر انسان قوی  
 مضحک، اعضاء کمزور، اور قوت فیصلہ جواب دے جاتے ہیں۔ اس کے  
 باوجود آزمائش کی کڑی دھوپ میں جس سرخروئی و کامیابی کے ساتھ  
 آپ نکلے یہ سرتاسر توفیق الہی و فیضانِ صحبت رسالت پناہی کی بے  
 پایاں برکتیں تھیں ورنہ اتنے مراحل کو کامیابی کے ساتھ جھیل لیجانا

یہ عام انسانی بس کی بات نہیں تھی۔

عبداللہ جسے توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں  
سرکارِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فوراً بعد انتہائی نازک صورت  
حال ہوا کے بدلے ہوئے رُخ اور حالات کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ  
کر بڑے بڑے شجاعانِ عرب کو پسینہ آ رہا ہے حتیٰ کہ فاروق اعظم جیسے  
سخت کوش اور استقامت کی کوہ پیکر شخصیت کا انداز فکر بدلانا نظر  
آ رہا تھا۔

ایسے عالم میں خدائے ذوالجلال نے اپنے ناتواں بند ابوبکر  
کے سینے کو انتہائی مضبوط و ناقابلِ تسخیر چٹان بنا کر اس میں نورِ بصیرت،  
عزیمت و استقامت، شہور و آگہی بے مثل فہم و ادراک، صحیح بروقت  
قوتِ فیصلہ کی توانائی و دیعت فرما کر ان کی ذات ستودہ صفات کو اسلام  
و مسلمانوں کا پناہ گاہ بنا دیا۔ انتہائی بے سرو سامانی کے عالم میں اسلام  
کی تحفظ و بقاء کی جو تاریخی جنگ حضرت ابوبکر صدیق نے لڑی ہے۔ اسلام  
کے پورے عسکری تاریخ میں اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ہے۔

یقین محکم عملِ پیہم محبت و فاتحِ عالم  
جہادِ زندگانی میں تھیں یہ مردوں کی شمشیریں

سرکارِ دو عالم کے جہدائی کا یہ صدمہ عظیم کیا کم قیامت تھا کہ منافقین کی  
خاموشی کو شششوں سے نظروں کے سامنے جسدا طہر کی موجودگی ہی  
میں بہترین و انصار کا اقتدار کے حصول کے لیے باہم ایک دوسرے سے  
الچھ کر تلوار بکالنے کے قریب پہنچ جانا۔ فاروق اعظم کے تعاون سے  
کمالِ دانائی کے ساتھ اس قیامت خیز ناتول میں اس پر بروقت قابو

پالینا۔ اس کے بعد فوراً ہی سرزمین عرب کا اپنے اندر سے سارے فتنوں کو بیک وقت زمین پر اگل دینا، یعنی جھوٹے مدعیان نبوت کا ظہور اور ان کی تباہ کاریاں منکرینِ زکوٰۃ اور ان کی فتنہ سامانیاں، قبائل کے قبائل کا اسلام سے پلٹ جانا، پھر ان مرتدین کی ہلاکت خیزیاں، اسلام و مسلمانوں سے تازہ تازہ زخم و مار کھائے ہوئے چھپے و کھلے ہوئے دشمنوں کا مشترکہ محاذ اور ان کی غارت گریاں، اور ان سب کا ایک ہی وقت میں اسلام کو مٹانے کی پھیم کوششوں کا ظہور اور ایسے عالم میں حضور پاک کی اتباع میں اسلام کی فوجی طاقت کو اسامہ بن زید بن حارثہ کی سپہ سالاری میں وطن سے ڈور ملک شام میں لڑنے کے لئے تمام وسوسوں، اندیشوں، مصلحتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھیج دینا۔ پھر اس فوج کی واپسی کا استظار کئے بغیر اسلام کے اندرونِ کافروں، منکروں ظالموں، دشمنوں سے اپنی فوجی قلت و تمام تر بے سرو سامانی کے باوجود لڑائی کے ہر محاذ کو کھول دینا اسلام کی بقا کی جنگ میں رہی سہی اسلام کی ساری توانائی کو داؤں پر لگا کر انھیں جنگ کی آگ میں جھونک دینا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر محاذ پر فتح و نصرت کا پرچم لہرانایا ایسے محیر العقول کارنامے ہیں جس پر تاریخ آج بھی انگشت بندھاں ہے۔

اڑائے کچھ ورق لالہ نے کچھ زنگس نے کچھ گل نے

چمن میں ہر طرف بھری ہوئی ہے داستاں میری

اندرون ملک عہد صدیقی کی سب سے خوفناک جنگ۔ جنگ یمامہ جو جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب سے لڑی گئی جو اتنی خوفناک تھی

کہ اسلامی لشکر کو پے در پے ہزیمتیں اٹھانی پڑیں بالآخر اللہ کی تلوار حضرت خالد بن ولید نے اس لڑائی کا فیصلہ کیا۔ باطل کا کس بل نکلا بد نہاد مسیلمہ کذاب جہنم رسید ہوا۔ مسلمانوں کا بھی بھاری جانی نقصان ہوا۔ اس جنگ کی ہلاکت خیزی کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ شہید ہونے والوں میں صرف شتر حفاظ قرآن تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں حفاظ قرآن کی شہادت ہی تدوین قرآن کا باعث ہوئی اس جنگ کے انجام نے منکرین مانعین ظالمین، باغیوں اور تمام سرکشوں کے کس بل نکال دیے۔ اب پھر جزیرہ انعب میں کوئی طاقت نہیں رہ گئی جو اسلام سے آنکھیں ملا سکے۔ سارا عرب ایک بار نئے سرے سے پھر مطیع و فرماں بردار ہو گیا۔

حضرت خالد بن ولید جنگ یمامہ سے جب فارغ ہو گئے تو خلیفۃ المسلمین حضرت ابو بکر صدیق کا حکم نامہ پہنچا کہ اپنی فوج لے کر عراق کی محاذ پر روانہ ہو جاؤ جہاں پر پہلے ہی سے حضرت مثنی بن حارثہ شیبانی حضرت ابو بکر صدیق کی اجازت سے اپنے جیالوں کے ساتھ عراق کے اندر گھس کر ایران کی عظیم طاقت کو لٹکا رکھے تھے اور مسلسل کئی محاذ پر ان سے اپنی بے پناہ جنگی قیادت کا لوہا منوا چکے تھے۔

خلیفۃ المسلمین کے حکم پر خالد بن ولید راستے کی ہر رکاوٹ پر قابو پاتے ہوئے راستے کی مختلف آبادیوں اور بستیوں کو اسلامی ریاست میں شامل کرتے ہوئے عراق کے بے خدا ہم شہر حیرہ میں پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے حیرہ کو

## کو فتح کر لیا

اے مَوجِ دَجَلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو  
رکتانہ تھا کسی سے سیلِ رِواں ہمارا  
حیرہ کے گرد متعدد قلعے بھی تھے جن کے قلعدار مختلف قبیلوں کے سردار  
تھے اور ہر قلعے میں عیسائی عربوں کی فوج تھی۔ حضرت خالد نے اپنے  
جانبازوں کو ان میں داخل کر کے ہر قلعے پر اپنا ایک ایک سردار مقرر  
فرمادیا۔

چنانچہ ضرار بن لادور نے قصر ابیض کا محاصرہ کیا جس میں ایاس  
بن قبیصہ طائی رہتا تھا۔ ضرار بن الخطاب نے قصر عدیسین کا محاصرہ  
کیا جس کا والی عدی بن عدی المقتول تھا۔ ضرار بن مقرامرنی نے  
قصر بنو مازن کا محاصرہ کیا۔ جس کا سربراہ ابن اکال تھا۔ اور مثنیٰ بن  
حارثہ شیبانی نے قصر ابن بقیلہ کا محاصرہ کر لیا۔ جس کا مالک عمرو بن  
عبد المسیح بن قیس بن حارث بقیلہ تھا۔ یہ چاروں قلعے تھے تو اہل  
فارس ہی کی عملداری میں کہ اس وقت عراق ملک فارس ہی کے  
تحت تھا۔ مگر یہ اپنے حدود میں آزاد تھے جو نوشیرواں عادل کے  
جلتے جاگتے شاہکار تھے۔

چوں نوشیرواں عدل کرد اختیار  
کنوں نام نیکش ازو یاد گار  
سزد کرد بدورشس چوں نازم چناں  
کہ سید بدوران نوشیرواں  
اور یہ ابن عبد المسیح کوئی معمولی آدمی نہیں تھا پورے عراق پر ابرا  
نی



قابض ہو گئے مگر اس کے باپ دادا نے ان قلعوں کو بچائے رکھا عراق میں رہ کر وہ فارس کی نمائندگی تو نہیں کرتا تھا مگر وہ ایرانیوں کے محکوم بھی نہیں تھا۔ بقیہ یہ تینوں قلعے اسی کے زیر اثر تھے۔

بذات خود وہ غیر معمولی طور پر بہادر و جری، طباع، ذہین اور حاضر جواب تھا حضرت خالد بن ولید کی ہدایت کے مطابق ان تمام اسلامی سرداروں نے ان تمام لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی مگر ان لوگوں نے سخی کے ساتھ اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر مسلمانوں کی طرف سے جزیہ کا مطالبہ ہوا کہ اسلام قبول نہیں کرتے ہو تو جزیہ دے کر ہماری اطاعت قبول کر لو۔ ہم تمہاری جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ مگر ان لوگوں نے اسے بھی نہیں مانا۔ پھر مسلمانوں نے ان تمام لوگوں کو ایک دن کی مہلت دی کہ خود غور کر لو۔ مگر وہ اپنی ضد پڑاڑے رہے۔ مجبور ہو کر مسلمانوں نے جنگ کا آغاز کر دیا۔

سب سے پہلے دشمن کو موقع دے کر ان پر حملہ کرنے والے ضرار بن الازور تھے۔ بے حد نڈر اور بہادر سردار ان کے طوفانی حملوں نے بہت جلد عیسائیوں کو اپنی اوقات یاد دلادی دیکھتے ہی دیکھتے قصر ابیض کو ضرار کے جیالوں نے اپنے پاؤں سے روند ڈالا۔

فوجی غیر فوجی پادری، راہب شہری سب امان کے لیے چلانے لگے۔ قصر ابیض کا حشر دیکھ کر بقیہ لوگوں کے عقل و ہوش خود ہی ٹھکانے لگ گئے اور انھوں نے بہ حال میں صلح ہی کو اپنی سلاہتی کے لیے ضروری سمجھا۔

چنانچہ تمام قلعے کے سرداروں اور معزز لوگوں کا ایک وفد عمر بن  
عبد المسیح کی قیادت میں حضرت خالد بن ولید کی خدمت میں صلح کی نیت  
سے حاضر ہوا۔

عمر بن عبد المسیح کافی طویل العمر تھا۔ ایک روایت کے مطابق  
اس وقت اس کی عمر دوسو سال تھی۔ حضرت خالد سے اس کی بڑی  
دلچسپ گفتگو ہوئی۔ اس قدر طویل عمری کے باوجود اس کی طبیعت  
ذہانت، بے خوفی اور حاضر جوابی سے حضرت خالد متاثر بھی ہوئے اور  
ضرورت سے زیادہ شوخی پر جھلائے بھی!

حضرت خالد نے اس سے پوچھا

تم کہاں سے آئے ہو؟

اپنے باپ کے پشت سے!

تم کہاں سے نکلے ہو؟

اپنی ماں کے پیٹ سے!

جھنجھلا کر:- ارے تم پر افسوس تم ہو کس چیز پر؟

ہم زمین پر ہیں!

تمہاری عمر کیا ہے؟

سیکڑوں سال!

اس طویل عرصے میں تم نے عجیب ترین بات کیا دیکھی؟  
میں نے دمشق سے حیرہ تک مسلسل آبادیاں دیکھیں اور یہ دیکھا کہ ایک  
عورت حیرہ سے سفر کرتی ہے مگر روٹی کے سوا اسے کوئی توشہ نہیں  
دیا جاتا۔

تم کچھ عقل سے بھی کام لیتے ہو۔

کیوں نہیں! عقل سے بھی کام لیتا ہوں اور قید سے بھی!  
میں تم سے سوالات کر رہا ہوں۔

اور میں آپ کو جواب دے رہا ہوں۔

اچھا یہ بتاؤ کہ تم صلح چاہتے ہو یا جنگ!  
ہم صلح چاہتے ہیں۔

تو پھر ان قلعوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟

یہ قلعے ہم نے اس لئے بنائے ہیں کہ کوئی بے وقوف اگر آئے تو ہم اسے  
قید کریں اور اگر کوئی سمجھدار آئے تو اس سے بچ کر چلا جائے۔

اس گفتگو کے بعد حضرت خالد بن ولید نے انہیں اسلام کی دعوت  
دی اور فرمایا کہ اگر تم نے اسلام قبول کر لیا تو ہمارے تمہارے حقوق  
برابر ہو گئے۔ اور اگر یہ بات تمہیں پسند نہیں تو پھر تمہیں جزیہ دینا پڑے  
گا۔ اور اگر تم اس سے بھی انکار کرو گے تو یاد رکھو ہم تمہارے لئے  
ایسی قوم لائے ہیں جو موت کو ایسے ہی محبوب رکھتی ہے جیسے تم شراب  
نوشی کو۔

ہم لوگ آپ سے لڑنا نہیں چاہتے ہیں۔

اس کے بعد ان لوگوں اور حضرت خالد سے صلح کے معاملات پر گفتگو  
شروع ہوئی اور معاملات صلح طے ہونے لگے کہ اسی درمیان ایک  
ادھیڑ عمر کا سپاہی حضرت خالد بن ولید کے سامنے کھڑا ہوا۔

حضرت خالد نے اس سپاہی سے آمد کی غرض دریافت کی۔

اے سالار اعظم اللہ کی رحمتیں آپ پر ہوں میرا نام شوہل ہے میں

ایک گزارش لے کر خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔

یہاں پر ہماری فتح مکمل ہو گئی ہے نا؟

بے شک! سارے معاملات طے ہو چکے ہیں اب صلحنامہ لکھا جانے والا ہے تو پھر اے سالار اعظم شہزادی کرامہ ہمیں دے دی جائے۔

بڑی حیرت کے ساتھ حضرت خالد نے اس عام سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیوں بھائی! شہزادی کرامہ تمہیں کیوں دی جائے۔

اس لیے کہ میرے آقا و مولے حضور رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے بہت پہلے شہزادی کرامہ عطا فرما چکے ہیں۔

دیکھو میرے بھائی! تم ایک بڑا دعویٰ کر رہے ہو کہ کرامہ کوئی عام سپاہی عورت نہیں ہے بلکہ حیرہ کی شہزادی ہے جب کہ اس کے مقابلے میں تم ایک عام سپاہی ہو۔ کیا تم اپنے اس دعویٰ کا گواہ پیش کر سکتے ہو کہ واقعی اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کرامہ کو تمہیں عطا فرما دیا ہے؟

کیوں نہیں یا امیر المومنین! جس وقت میرے آقا نے یہ فرمایا تھا اس وقت میں اکیلا نہیں تھا اور لوگ بھی تھے۔ اور شاید اس میں سے کچھ لوگ یہاں ہوں بھی۔

تو جاؤ کم از کم دو گواہ ضرور پیش کرو۔ اگر تم نے گواہ پیش کر دیئے تو کرامہ تمہیں دے دی جائے گی۔

تلاش کے بعد اسلامی فوج میں دو گواہ ایسے مل گئے جنہوں نے حضرت خالد بن ولید کے سامنے یہ گواہی دی کہ بے شک اللہ کے

مقدس رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حیرہ فتح کے بعد کرامت  
عبدالمنجج کے لئے شویں سے وعدہ فرمایا تھا۔

صورت واقعہ کی تفصیل میں جاتے ہوئے ان لوگوں نے بتایا کہ  
ایک دن ہم لوگ آقائے کائنات مصطفیٰ جانِ رحمت (اجسادنا و ارواہنا  
فداہ) صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہِ رحمت میں حاضر تھے۔ اثنائے  
گفتگو ذکرِ چل پڑا اسلامی فتوحات کا باتوں باتوں میں فارس کی شہنشاہ  
اور کسری ایران کا ذکر نکل پڑا۔ ہم میں سے کسی نے عرض کیا یا رسول  
اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان اگر حیرہ ہاتھ آجائے تو کسری پر کار  
ضرب لگائی جاسکتی ہے۔

مشہور مورخ ابن جریر طبری و بلاذری کے مطابق غیبت کی  
خبریں دینے والے نبی نے ارشاد فرمایا عنقریب حیرہ مسلمانوں کے  
ہاتھوں فتح ہو جائے گا۔ پھر اسی محفل میں حیرہ کی اہمیت اس کے  
گرد و نواح کی خوبصورتی و شادابی کا ذکر چھڑ گیا۔

عزوبن عبدالمنجج وہاں کی مشہور شخصیت تھی اس کی ایک بیٹی  
کرامت تھی۔ جو رغبنانی شباب کی سپیکر، صبح مسرت کے اُجالوں کی  
طرح روشن اور جس کی خوبصورتی کی داستان دور دور تک  
سہلی ہوئی تھی۔

شاید کہ میرے لب پہ پھر تیرا نام آیا  
کیوں صحنِ تمنا میں بجنے لگی شہنائی

و مقدس و بابرکت محفل میں یہ سادہ لوح دیہاتی بھی بیٹھا ہوا  
تھ کہ جس نے جوں ہی سرکار سے حیرہ فتح ہونے کی خوشخبری سنی تو بے

بھولپن سے کہنے لگا یا رسول اللہ کیا حیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو جائے گا

بے شک حیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوگا۔

یا رسول اللہ تو قلعہ بقیلہ بھی فتح ہو جائے گا۔

یاں قلعہ بقیلہ بھی فتح ہو جائے گا۔

یا رسول اللہ تو عبد المسیح کی بیٹی کرامہ ہمیں دیدی جائے سرکار مسکرا

لگے نہ

یوں مسکرائے جان سی کیوں میں پڑ گئی

یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

مسکراتے ہوئے فرمایا اچھا فتح کے بعد کرامہ تمہیں دیدی جائے گی۔

عمر بن عبد المسیح اسے اچھی طرح سے سن لو۔ رسول خدا کا

وعدہ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ تمہیں ہر جاں میں اپنی بیٹی

کرامہ کو اس شخص کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔

حضرت خالد کے اس فیصلے نے اہل حیرہ کو ایک نئی پریشانی

میں مبتلا کر دیا۔ عبد المسیح کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اسے شدید زہنی

جھٹکا لگا قریب تھا کہ وہ اسے اپنی امانت سمجھتے ہوئے سختی سے انکار

کر دیتے۔ مگر حضرت خالد کے مستحکم عزائم اور خوفناک سنجیدگی نے

انہیں جو اس باختہ کر دیا۔ کافی غور و توجہ کے بعد بالآخر ابن عبد المسیح

نے ایک دانشمندانہ فیصلہ کرتے ہوئے کہا ٹھیک ہے کرامہ آپ کی

خدمت میں پہنچا دی جائے گی جوں ہی یہ خبر وحشت اثر شاہی

محل میں پہنچی وہاں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا

کہ شہزادی کرامہ ایک بدو عرب کو ذی جائے۔ فریب تھا کہ ایک ہنگامہ دار  
 و گیر بڑا پا ہو جائے کہ شہزادی نے سمجھاتے ہوئے کہا میرے عظیم باپ نے  
 میرے بارے میں بڑا دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔ میری طلب کرنے والا  
 کوئی اتحق ہی ہوگا شاید کسی سے اس نے میری جوانی کے تذکرے سن  
 لیے ہوں گے اور اپنی فطری حماقت سے جوانی کو کوئی سدا بہار چیز  
 سمجھ رہا ہوگا۔ اس نے میری جوانی و حسن کے قصے تو سنے لیکن زمانہ نہیں  
 دیکھا، میرے جلوہ حسن کی تشہیر کا زمانہ، میرے عالم شباب کا زمانہ تھا  
 جب رگ و پے میں آتش سیال بجلیاں بھرے ہوئے تھے  
 پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں  
 پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

مجھے اس بدو کے پاس لے چلو مجھے یقین ہے کہ بہت جلد اپنے محل میں  
 واپس آجاؤں گی۔ کینزوں کے جلو میں شہزادی جوں ہی شوہل کے  
 پاس پہنچی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے حیرت کو جھٹکا اور بدن  
 میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس سادہ لوح عرب کے سامنے حسن و ادا دکھی  
 و دلاوری اور رعنائی شباب کے پیکر مجسم کے بجائے کینزوں کے  
 جلو میں ایک اشہی سالہ باوقار ضعیفہ خاتون کھڑی تھی جس کے ہرے  
 پہ جھڑیاں اور بال سفید ہو چکے تھے اور جس کے رخ زینا کے نقوش اول  
 باوقار سراپے پر عہد رفته کی خوشگوار کہانیاں رقم تھیں۔

ڈوبا ہوا ہے دل مرا یادوں کی جھیل میں

آنکھوں میں خواہشوں کی تھکن کا خمار ہے

میں کرامہ بنت عبد المسیح ہوں سنا کہ تم نے ہماری طلب کی ہے تو آخر میں

اشی سالہ بڑھیا تمہارے کس کام کی؟ کیا بہتر نہیں ہوگا کہ مجھ سے کوئی رقم  
نے کر مجھے آزاد کر دو۔

بڑی شکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے شوہل نے کہا۔ کیوں نہیں!  
لیکن رقم مقرر کرنے کا اختیار مجھے ہوگا۔

ہاں ہاں جتنا چاہو مقرر کر لو۔  
تو سن لو میں اپنی ماں کی اولاد نہیں اگر تم سے ایک ہزار درہم

کم لوں۔

کیا ایک ہزار درہم زیادہ نہیں۔

نہیں ہرگز نہیں اس سے ایک درہم بھی کم نہیں ہوگا۔

شہزادی کا اشارہ پا کر ایک کینز محل سے بھاگ کر ایک ہزار  
درہم لا کر شوہل کے آگے رکھ دیا۔ وہ سادہ لوح عرب جس نے اپنے  
زندگی میں ایک ہزار درہم نہیں دیکھا تھا۔ اتنے درہم اکٹھا دیکھ کر بڑا  
حیران اور ساتھ ہی بہت خوش بھی ہوا۔ اور خوشی خوشی شہزادی  
کو واپسی کی اجازت دی۔ شہزادی بیتے ہوئے دنوں کا تصور لئے  
ہوئے شاہی محل میں واپس ہوئی۔

آج ٹوٹے ہوئے سپنوں کی بہت یاد آئی

آج بیتے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا

شوہل وہ ایک ہزار درہم لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچے اور  
اپنا کارنامہ بیان کرنے لگے۔ ارے بھائی میں تو پھنستے پھنستے بچ گیا  
وہ کبخت جس کی خوبصورتی کی اتنی دھوم مچی ہوئی تھی وہ تو راستی  
سالہ بڑھیا نکلی۔ میرے ساتھ بڑا دھوکہ ہوا۔



لیکن وہ بڑھی بھی کیا یاد کرے گی میں نے پورے ایک ہزار درہم اس  
وصول کر کے تب چھوڑا ہے

اب کون کرے جلوہ رنگین کی تمت

تم سے کہیں ہمیں تھا تمہے خواب کا عالم

کیا صرف ایک ہزار درہم لے کر تم نے اسے چھوڑ دیا۔ ازلے بدھو وہ  
شاہی خاندان کی عورت تھی اس سے چاہے جتنے ہزار درہم چاہتے  
لے لیتے لیکن تم زندگی بھر بدھو کے بدھو رہ گئے۔

اچھا تو ایک ہزار سے بھی زیادہ درہم ہوتا ہے بہم کو تو یہی معلوم  
تھا کہ ایک ہزار سے زیادہ درہم ہی نہیں ہوتا  
ع اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اسے خدا

بلاذری نیز ابن جریر طبری نے تاریخ طبری کے حصہ دوم میں  
کرامہ کے حوالگی پر تفصیلی گفت گوئی ہے۔

علم غیب مصطفیٰ کے منکرین و مانعین کو اس عظیم واقعے سے  
عبرت حاصل کرنا چاہئے۔ آخر وہ تاریخ کی ان جیسے صدی حقیقتوں کو  
کب تک جھٹلاتے رہیں گے۔ اور بھری دوپہر میں سورج کی حقیقت  
سے انکار کی دھابندھلی کب تک چلائیں گے

گر نہ بیند بروز شہرہ چشم

چشمہ آفتاب را چہ گناہ



# کفن چور

بنو انصار کا وہ گل رعنا نسوانی وقار اور جمال و دلکشی کا پیکر تھا  
بن کر جب شباب کی ابتدائی دہلیز تک پہنچا تو جانے کتنی آنکھوں  
میں اُمید و اشتیاق کی تمنائیں مچنے لگیں سے

ذہن میں انگریزائیاں لیتا ہے جب تیرا خیال  
شاخ لب پر مرے کھلتے ہیں تسم کے گلاب

حسن کی قوت تسخیر تو یوں ہی بڑی ظالم ہوتی ہے اور جب اس میں  
شرم و حیا اور غیرت کی بھی آمیزش ہو جائے تو وہ دو آتشہ ہو جاتی  
ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی وقت و حالات کی دھڑکنیں بھی بے  
ترتیب ہو جاتی ہیں

ع خندہ گل جنبش لب بوئے گل تقریر ہے

اس کے پاکیزہ کردار اور مثالی حسن کا تذکرہ وفا کی خوشبو کی طرح  
خاندان عزیز و اقارب سے آگے نکل چکا تھا جس کی وجہ سے بہت

سارے خوابوں اور خیالوں پر از خود اس کا قبضہ ہو چکا تھا

دل میں دھڑکن کی طرح آنکھ میں آنسو کی طرح

تم میرے پاس رہو پھول میں خوشبو کی طرح

مگر ابھی اس کا شبستان وجود بابل کے آنگن ہی کو مہکا رہا

تھا۔ اس رعنائی شباب کی چھٹکی چاندنی سے کسی اور کے درو بام منور  
نہ ہو سکے تھے البتہ دل کے بہت سے ویران دریچے اپنے صحن تمنائیں  
اس کے وجود کی خوشبو کے لئے شدت سے بے چین تھے سے

تو میرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جان حیات  
جانے کیوں تیرے لئے دل کو دھڑکاتا دیکھوں

کاشانہ فحمت میں زلفوں کے بکھرنے کا موسم قریب آچکا تھا۔ فطرت کی  
خاندنیاں اپنی تیاریاں مکمل کر چکی تھیں۔ منشا، تخلیق کی تکمیل میں  
کلی پھول بنا چاہ ہی رہی تھی کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسکی  
بستی کے تار و پود کو بکھیر دیا بہت سارے وہ دل جو اس کے پاکیزہ

تصور سے دھڑکتے تھے زخمی ہو کر لہو لہان ہو گئے یہ

آنکھیں کھلیں تو جاگ اٹھیں حسرتیں تمام

اس کو بھی کھو دیا جسے پایا تھا خواب میں

رات اپنا سیاہ بازو پھیلائے کائنات کو اپنی آغوش میں لینے  
کے لیے رواں دواں تھی۔ شب کی سیاہ زلفیں ابھی کمر تک نہیں۔  
پھیلی تھیں۔ کہ رات کے اسی سناٹے میں ایک سایہ محتاط انداز  
میں چاروں طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ  
ایک قبرستان میں داخل ہو گیا۔

تاریک رات کا پُربول سناٹا سارے ماحول پر مسلط تھا۔  
ایسے وحشت خیز سناٹے میں وہ شخص ہر خوف سے بے نیاز ہو کر  
یکے بعد دیگرے قبروں کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ایسا  
لگتا کہ اسے کسی خاص قبر کی تلاش ہو۔ یہاں تک کہ وہ ایک

تازہ قبر پر پہنچ کر رک گیا۔

ارد گرد پھر ایک بار نظر میں ڈوڑا کروہ قبر کی مٹی کو ادھر ادھر بٹانے لگا  
جلد ہی قبر کے تختے کو الگ کر کے قبر کے اندر داخل ہو گیا۔ بڑی مشاقی  
کے ساتھ کفن کو میت سے اتارا پھر قبر برابر کی اور چل دیا۔

اس وقت بھی خموش رہی چشم پوش رات

جب آخری رفیق بھی دشمن سے بل چکا

ابھی وہ کچھ ہی ڈور گیا تھا کہ اس بے جان جسم کے بے حد پرکشش  
سراپے اور اس کے خدو خال کی دلاویزی کی تصویر نے اس کے دل  
میں ہوس کے شیطان کو بیدار کیا۔ جذبہ شہوانیہ کے زیر اثر  
وہ وہیں سے واپس ہوا۔ بڑی وحشت خیزی کے ساتھ نئے سرے  
سے قبر کھودی تختہ اٹھایا اور قبر میں اتر گیا۔

اس بار خلاف معمول وہ قبر میں دیر تک رکا رہا۔ اور جب

بکلا تو جیسے خوف و دہشت نے اس کے لہو کو چوڑ لیا ہو۔ عالم وحشت  
میں جیسے تیسے قبر کی مٹی برابر کی پھر افتاں و خیزاں ایک طرف کو بھا  
بکلا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں کفن بھی نہیں تھا۔ آنکھیں ساون  
بھا دوں بنی ہوئی تھیں۔ خوف و ہراس کے عالم میں اسے کسی جائے  
پناہ کی ضرورت تھی اپنے درد کے درماں کے لئے وہ کس جا میں جا تا  
پہنچنے کے لئے بے قرار تھا مگر اس کی قوت فیصلہ جواب دے چکی  
تھی کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔

گیلے کاغذ کی طرح زندگی ٹھہری اس کی

کوئی لکھتا بھی نہیں کوئی جلاتا بھی نہیں

خوش بختیوں کے اُجالے میں بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ ایک دن  
 فاروق اعظم آقائے کائنات مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ  
 وسلم کی بارگاہِ رحمت میں حاضر ہوئے۔  
 عمر! سببِ گریہ کیا ہے؟

یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان! ذرا قدس پر ایک  
 نوجوان کھڑا رہا ہے اس کے گریہ و زاری آہ و فغاں اور تپ سینہ  
 سوزاں سے دل پھٹا جا رہا ہے۔ وہ اندر آنا تو چاہ رہا ہے مگر ہمت  
 نہیں کر پا رہا ہے

آتشِ تردامنی نے دل کے کیا کیا کباب  
 خضریٰ جاں ہو بلا دو ماہیان سوختہ

عمر! اسے اندر بلاو!

نوجوان نے لرزتے کانپتے کاشانہ نبوت میں قدم رکھا۔  
 اللہ کے بندے اس قدر گریہ و زاری کیوں۔

یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان! میں ایک سیہ کا  
 بدکار اور بہت بڑا گنہگار و مجرم ہوں اپنی گناہوں کی کثرت سے  
 خوف زدہ ہوں کہ کیا خدائے ذوالجلال مجھ جیسے مجرم کو بھی بخشے گا؟  
 دلِ عبثِ خوف سے پتہ سا اٹا جاتا ہے

پلہ ہلکا سہی بھاری ہے بھروسہ تیرا  
 اے نوجوان کیا تم نے شرک یعنی اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود مان  
 لیا ہے؟

نہیں یا رسول اللہ! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

کیا تم نے کسی کو ناحق قتل کر دیا ہے ؟

ہرگز نہیں اے اللہ کے حبیب !

تو سن لے اے نوجوان ! اگر تیرے گناہ ساتوں آسمانوں، زمینوں  
سارے پہاڑوں کے بھی برابر ہوں تو خدائے ذوالجلال اسے اپنے  
فضل و رحمت سے بخش دے گا

بد سہی چور سہی مجرم و ناکارہ سہی

اے وہ کیسا ہی سہی ہے تو کریم تیرا

یا رسول اللہ میرے گناہ ساتوں آسمانوں، زمینوں اور سارے پہاڑوں  
سے بھی بڑے ہیں۔

تیرے گناہ بڑے ہیں یا کرسی ؟

میرے گناہ کرسی سے بھی بڑے ہیں۔

تیرے گناہ بڑے ہیں یا عرش الہی ؟

میرے گناہ ! یا رسول اللہ

تیرے گناہ بڑے ہیں یا خدائے ذوالجلال ؟

ہیں نہیں اے میرے آقا خدائے ذوالجلال تو بہت عظیم ہے۔

بے شک بزم عظیم کو رب عظیم ہی معاف فرماتا ہے

ایک میں کیا میرے عصیاں کی حقیقت کتنی

مجھ سے سولاک کو کافی ہے اشارا تیرا

اے نوجوان اپنے گناہوں کو بیان کرو !

یا رسول اللہ شرم و ندامت سے اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پارھا

ہوں کہ سرکار کے حضور لب کشائی کر سکوں۔

کوئی بات نہیں تم کچھ تو بتاؤ

یا رسول اللہ میں ایک کفن چور ہوں اور سات برس سے یہی میرا ذریعہ معاش ہے۔ جوں ہی کوئی آدمی انتقال کرتا ہے تو دفن کے لیے ساتھ ہی میں جنازے کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ اور بڑی خاموشی کے ساتھ اس تازہ قبر کو اپنے نگاہوں میں رکھ لیتا ہوں اور پھر جب رات ہوتی ہے تو میں وہاں پہنچ کر قبر کھود کر میت کے جسم سے کفن اتار کر لے آتا ہوں جسے بیچ کر میں اپنی روزی روٹی حاصل کرتا ہوں۔

چند دنوں پیشتر انصاری کی ایک لڑکی کا انتقال ہوا۔ رونا دیرینہ کے مطابق رات کے سناٹے میں اس کی قبر پر پہنچ گیا۔ بڑی احتیاط سے قبر کھودی تختہ علیحدہ کیا اور میت کی نعش سے کفن اتار لیا پھر برابر کیا اور واپسی کے لئے چل پڑا۔

وہ لڑکی اپنی زندگی میں بڑی خوبصورت تھی واپسی میں اس کے برہنہ جسم کے تصور نے میرے اندر کے شیطان کو بیدار کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے اوپر ہوس کا شیطان مسلط ہو گیا۔ میں راستے ہی سے واپس ہوا۔ قبر کھودی اور اس کے اندر اتر کر اس نوجوان لڑکی کی برہنہ لاش سے مباشرت کی۔ میں مباشرت سے فارغ ہو کر جوں ہی چلنے لگا۔ یا رسول اللہ وہ مردہ لڑکی قبر میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور قہر و غضب کے عالم میں کہنے لگی۔ خدائے غارت کرے ایک مردہ جسم کے ساتھ بدکاری کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی اور تو اس خدائے قہار و جبار کے غضب سے بھی نہیں ڈرا جو ہر مظلوم کو ظالم سے

اس کا حق دلاتی ہے پہلے تو نے مجھے مُردوں کی جماعت میں ننگا کر کے تشریف  
کیا اور جب میں بارگاہ الہی میں پیش ہو چکی تھی تو ایسے عالم میں تو نے  
مجھے ناپاک کیا۔

اتنا سننا تھا کہ آتش غضب نے رخسارِ رحمتِ عالم کو سُرخ  
کر دیا اور عالمِ غضب میں فرمایا او بد بخت ہٹ جانظروں کے  
سامنے سے۔ تو۔ تو نارِ جہنم کا مستحق ہے۔ ع۔  
غضب سے اُن کے خدا بچائے جلالِ باری عتاب میں ہے

امید کی مدھم سی جو لو تھی وہ بھی بجھ گئی اب دنیا اس کی ننگا ہوں میں  
تاریک ہو گئی۔ اس کی آخری آس یا س میں بدل گئی۔ خوفِ آخرت  
اور غضبِ الہی سے لرزاں و ترساں تو پہلے ہی سے تھا۔ اب اس  
میں اور اضافہ ہو گیا۔

بے قرار دل اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ الحاج و زاری  
آہ و فغاں اور توبہ و استغفار کرتا ہوا صحر کی طرف نکل گیا۔ اور  
مسلسل چالیس دن تک روتا بلکنا اور توبہ و استغفار کرتا رہا۔  
اکتالیسویں دن بستی ہوئی آنکھوں اور دل روز آہوں کے ساتھ  
آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بارگاہ الہی میں عرض کرنے لگا۔ اے محمد  
ابراہیم اور آدم کے رب اگر تو نے میرے گناہ بخش دیے ہیں تو اس  
کی اطلاع اپنے پیارے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیدے او  
اگر نہیں بخشا ہے تو پھر آسمان سے ایک آگ بھیج دے جو میرے وجود کو  
جلا کر خاکستر کر دے تاکہ میں جہنم کی آگ سے بچ جاؤں۔ بالآخر اس کے پر خلوص  
توبہ و ندامت اور گریہ و زاری نے رحمتِ الہی کو اپنی طرف متوجہ کر ہی لیا



مکین سدرہ سید الملائکہ حضرت جبریل امین بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے  
 یا رسول اللہ آپ کو آپ کا رب سلام پیش فرما رہا ہے اور ساتھ  
 ہی دریافت فرما رہا ہے کہ اے محبوب مخلوق کو کس نے پیدا کیا ہے؟ آیا  
 تو نے یا میں نے!

اے جبریل تمام مخلوق کو میرے پاک و بے نیاز رب نے پیدا فرمایا  
 ہے اور ہی جسد مخلوقات اپنے فضل و رحمت سے رزق بھی عطا فرمانا  
 ہے۔ تو پھر یا رسول اللہ اس گنہ گار نوجوان کو بلا کر خوشخبری سنا دیں  
 کہ اس کے رب نے اس کی خطا کو معاف کر دیا ہے اور اس کے توبہ  
 کو قبول فرمایا ہے۔

ایں درگہ مادرگہ نا امیدی نیست  
 صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

وہذا مستفاد من مکاشفۃ القلوب للإمام الغزالی  
 اللہ اتنا بڑا مجرم بخش دیا گیا۔ تو ہم گنہ گاروں کو چاہئے کہ اللہ  
 کی بارگاہ رحمت میں سچے دل سے توبہ کریں اور اس کی بارگاہ سے  
 مایوس نہ ہوں۔

بہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں  
 راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

# جہانِ حیرت

بریلی کے جواب نے علمائے رامپور کو ایک نئی صورتِ حال سے دوچار کر دیا۔ سرآمد روزگار علماء میں فکر و تشویش کی ایک نہرتازہ دوڑ گئی۔ ریاست رامپور کے والی نواب کلب علی خاں کے استفتا، کا یادگار سلف حضرت مولانا ارشاد احمد مجددی نے جواب لکھا۔ جس کی تصدیق رامپور کے مشاہیر علماء نے فرمائی۔

بریلی میں خاتم المحققین حضرت مولانا نقی علی خاں کے علم و فضل کا شہرہ بلند تھا اس فتویٰ پر آپ کے دستخط کے حصول کے لیے وہ بریلی بھیجا گیا۔ خلاف اُمید بریلی کے تحقیقی جواب نے ان حضرات کے علم و تحقیق کی بساط ہی الٹ دی۔

دستی جواب لانے والے کو بلا یا گیا۔ یہ جواب جو تم بریلی سے لائے ہو یہ خود مولانا نقی علی خاں صاحب کا لکھا ہوا تو نہیں ہے۔ کسی گننام آدمی نے لکھا ہے۔ البتہ ان کی تصدیق ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ آیا مولانا نے اس جواب کو یوں ہی سرسری نگاہ ڈال کر دستخط کیا تھا یا بہت غور سے پڑھا تھا پھر دستخط کیا ؟

حضور والا انھوں نے اس فتوے کو دیکھا پھر جا کر دستخط کی اور ہر گائی۔

صورتِ حال کی تفصیل بیان کرو ؟

جب میں رامپور سے یہ لفافہ لے کر مولانا صاحب کی خدمت میں پہنچا اور انھیں پیش کیا تو آپ نے ایک نظر دیکھ کر فرمایا کہ بازو کے کمرے میں ایک مولوی صاحب بیٹھے ہیں انھیں کو لے جا کر دے دو جو کچھ لکھنا ہو گا لکھ دیں گے۔ آپ کی نشاندہی پر جب میں اس کمرے میں پہنچا تو وہاں کسی مولوی صاحب کو نہ پا کر پھر واپس مولانا صاحب کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا حضور عالی اس کمرے میں تو کوئی مولوی صاحب نہیں ہیں البتہ ایک صاحبزادے تشریف فرما ہیں۔ آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا ہاں ہاں بھائی وہی صاحبزادے ہی مولوی صاحب ہیں آج کل اس طرح کا کام وہی کرتے ہیں۔

چنانچہ آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے جا کر یہ لفافہ انھیں پیش کیا انھوں نے اسے کھول کر ایک نظر دیکھا پھر کہنے لگے اگر آپ کو فوری جواب کی ضرورت ہے تو کچھ دیر ٹھہرنا پڑے گا۔ آپ باہر چل کر اطمینان سے بیٹھے میں آپ کو بلاؤں گا۔

کافی دیر بعد وہ کمرہ سے نکلے اور جو کچھ انھوں نے لکھا تھا اسے مولانا تقی علی خاں کو پیش کیا۔ آپ نے کافی غور و خوض سے اسے ملاحظہ فرمایا اس کے بعد دستخط کر کے مہر لگائی۔ لفافے میں بند کر کے مجھے دیا میں نے ویسے ہی آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ہوں! تو گویا کہ ایک طرح سے یہ انھیں کا فتویٰ ہے۔

جواب لکھنے والے نے یادگار سلف حضرت مولانا ارشاد احمد صاحب قبلہ کی کوہ پیکر شخصیت سے صرف نظر کرتے ہوئے اس بات کا بھی احساس نہیں کیا کہ ان کی حمایت و تصدیق میں سرآمد علماء کی بڑی تعداد میں

دستخطیں و مہرین ثبت ہیں۔

ارے بھائی کسی مسئلے میں علماء کا اختلاف یہ کوئی نئی بات نہیں۔  
تحقیقات علیہ کا دروازہ نہ کل بند تھا اور نہ آج ہی بند ہے۔ اس میں  
بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے بعینہ یہ فتویٰ نواب تک پہنچنا چاہئے۔ آخر وہ  
بھی صاحبِ علم و فضل ہے خانوادہ خیر آبادی سے نسبت تلمذ کا فخر  
حاصل ہے۔ دونوں فتوؤں میں جو واضح فرق ہے اسے وہ بھی تو  
محسوس کرے گا۔ ان میں کے ایک سنجیدہ عالم نے مشورہ دیا۔ چنانچہ  
کافی تامل اور غور و فکر کے بعد استفتاء اور دونوں جوابوں کو نواب کے  
حضور پیش کر دیا گیا۔

نواب صاحب نے بڑے غور سے پہلے مولانا مجددی صاحب کے  
جواب کو ملاحظہ فرمایا۔ ساتھ ہی معاصر علمائے رامپور کے تصدیقات پر  
بھی نظر ڈالی اور ایک آسودہ سانس لی۔

مگر جب اس نے بریلی کا جواب پڑھنا شروع کیا تو اس کے  
پیشانی پر بل پڑنا شروع ہو گئے۔ جوں جوں جواب پڑھتا گیا جبرت و  
استعجاب بڑھتا گیا اور جب پورا جواب پڑھ چکا تو حیرت نے اضطراب  
کی شکل اختیار کر لی۔ فوراً خادم خاص کو آواز دی مولانا ارشاد احمد  
صاحب کو سلام پیش کرو اور تشریف آوری کے لیے عرض کرو۔

طیبِ عشق سے پوچھا زلیخانے علاج اپنا  
کہا واجب ہے جھکو صورتِ یوسف کا دم کرنا  
اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ نواب صاحب! بندے کو آپ نے  
یاد فرمایا ہے ۹

وعلیکم السلام ورحمة اللہ وبرکاتہ۔ خوش آمدید مرحباً اھلاً وسہلاً۔  
 نہ ہے نصیب۔ تشریف آوری کی زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔  
 کوئی بات نہیں یہ تو آپ کی محبت ہے۔ ویسے بندے کو یاد فرمائی  
 کی زحمت کیوں فرمائی گئی؟  
 بات کچھ عجیب سی ہو گئی ہے کہتے ہوئے بھی جھمک محسوس  
 ہوتی ہے۔

بے تکلف ارشاد فرمائیں ہم جیسے درویشوں کے لئے اتنا تکلف  
 کیوں؟

بات کچھ یوں ہے کہ چند دن پہلے میری طرف سے آنجناب کے  
 خدمت میں ایک استفتاء ارسال کیا گیا تھا جس کا آپ نے جواب بھی  
 مرحمت فرمایا ساتھ ہی جلیل القدر علمائے رامپور کی تصدیقات سے وہ  
 فتویٰ مزین بھی تھا۔ مزید تصدیق کے لیے میری خواہش کے مطابق اے  
 بریلی بھی بھیجا گیا۔ استفتاء ان کی بلند پایہ شخصیت کی اہمیت کے  
 پیش نظر ایسا کیا گیا کہ ان کی جلالت علمی ایک امر مسلم ہے۔

بے شک مولانا تقی علی خاں ایک بے پناہ علمی شخصیت کے  
 حامل عالم باعمل اور ایک سچے عاشق رسول بزرگ ہیں ہندستان  
 میں ابھی ان جیسے بزرگوں کا دم بہت غنیمت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو  
 اسلاف کے سچے یادگار ہیں۔

لیکن حضور والا! وہاں کے جواب نے تو ایک نئی صور حال  
 سے دوچار کر دیا ہے۔ خود ہی ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کہہ کر استفتاء مع جواب آتا

سائے رکھ دیا۔ استفتاء اور بریلی کے جواب کو حضرت مولانا نے بڑی گہری  
نظروں سے ملاحظہ فرمایا۔

پھر ایک آسودہ سانس لیتے ہوئے فرمایا قبلہ نواب صاحب فتویٰ  
وہی صحیح ہے جو بریلی سے لکھ کر آیا ہے۔

یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ بڑی حیرت ہو رہی ہے کہیں کسر نفس  
سے تو نہیں کام لے رہے ہیں آپ؟

یہ کسر نفس نہیں بلکہ فراخ دلی کے ساتھ اظہار حقیقت ہے فتویٰ  
نویسی مولوی احمد رضا خاں کے نام سے کان آشنا تو نہیں لیکن انہی  
بلند پایہ تحقیقات علمی سے انکار ممکن نہیں اس پر مستزاد مولانا نقی علی  
خاں سلمہ کی تصدیق نے اس تحقیق کو اعتبار کی اعلیٰ ترین سند عطا  
فرمادی ہے۔

لیکن حضور کے جلالتِ علمی کا آفتاب بھی تو اپنی جگہ پر مسلم  
ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس کے بارگاہِ فضل و کمال سے لوگ اپنی  
تحقیقات کو اعتبار کی سند سے مزین کریں۔ جس کی علمی عظمتوں شکوہوں  
کے سامنے جانے کتنی گردنیں خم ہوں کیا یہ بات عجیب نہیں کہ اس کی  
علمی تحقیق ایک گناہ مولوی کے تحقیق سے فروتر ہو۔

قبلہ نواب صاحب! آپ تو ذی علم آدمی ہیں۔ مستزاد برآں  
خیر آبادی خانوادے سے نسبت تلمذ کا شرف بھی آپ کو حاصل ہے۔  
کیا انسان مرکب من الخطاء والنسیان ایک ٹھوس حقیقت  
نہیں میں بھی ایک انسان ہوں خطا چوک مجھ سے بھی ہو سکتی ہے۔

چلئے آپ سے چوک ہو گئی..... مگر آپ کے جواب پر تصدیق کے لئے جو یہ نامی گرامی علمائے کرام کے ناموں کی ایک طویل فہرست مع مواہیر ثبت ہے۔ کیا ان سب کے اجتماعی غلطیاں سرزد ہوئیں؟ ان حضرات نے دستخط کرتے وقت اپنی تحقیقات و معلومات زیادہ اعتماد میری ذات پر کیا کہ ارشاد احمد مجددی نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ صحیح ہی ہو گا۔ ان سے اجتماعی خطا میری علمی قدر و شہرت پر اعتبار کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ جبکہ مولوی احمد رضا سلمہ نے میری شہرت سے زیادہ اپنی ذات پر اعتماد کیا۔ جو کسی بھی ذمہ دار شخصیت کے لئے ناگزیر ہے۔ مجھے پوشی ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے اعتبار کے اس پرانے پیمانے کو توڑ کر تحقیق کی لاج رکھ لی۔ اور اس جرأت اظہار ضرورت پر مولانا نقی علی خاں جیسی بزرگ شخصیت نے حوصلہ افزائی کی مہر لگا دی اور یہی ہونا چاہئے۔

تمہیں جرأت اظہار شوق دی ورنہ  
مجال کیا تھی ہماری کہ آرزو کرتے

حضور والا اس حقیقت پسندانہ جرأت اظہار پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں اپنی کسی چوک کو اور وہ بھی اپنے چھوٹوں کے مقابلے میں بطیب خاطر قبول کر لیں یہ آپ کی بڑائی ہے۔ آپ کی قدر اور احترام میرے دل میں اور بڑھ گیا۔ مولیٰ عزوجل آپ کے سایہ عاطفت کو تادیر ہم پر سلامت رکھے۔

آپ کے اس فراخ دلانہ انتہائی جرأت مندانہ اظہار حقیقت اور ایک گنام آدمی کے بلند پایہ تحقیقات کو ایسے انداز میں سند

اعتبار نے میری آتش شوق کو ہوا دیدی ہے کہ ایسی علمی شخصیتوں کے تعارف اور ان کا نیاز حاصل کیا جائے۔

وحشتیں بڑھتی گئیں میرا جنوں تازہ ہوا  
اب کسی کی یاد کی شدت کا اندازہ ہوا

بے حد قریبی رشتے دار کے ذریعہ جب نواب رامپور کا دعوت نامہ مولا نا احمد رضا خاں کو ملا تو آپ والد محترم کی اجازت سے رامپور تشریف لائے۔ نواب نے والہانہ پذیرائی کی کسنی اور چہرہ زیبا پر آغاز سبزہ دیکھ کر خیر خیر مسرت کے ساتھ مرجبا کہا۔ اور بڑی محبت کے ساتھ اپنی پلنگڑی پر بٹھالیا۔ لوازمات تیزبانی کے بعد نواب صاحب نے کہنا شروع کیا۔ ماشاء اللہ، سبحان اللہ! اس کسنی کے عالم میں فقہ میں درک و دینیات میں جو کمال آپ نے حاصل کر لیا۔ اس پر وقت کی بے کراں علمی شخصیتوں نے آپ کی تحقیقات علمیہ کو اعتبار کی سند بھی مرحمت فرمادی ہے۔ یہ بہت بڑی بات اور تاریخی نوادرات سے ہے۔

میری خواہش ہے کہ جہاں آپ نے دینیات میں اس درجہ کمال حاصل کر لیا ہے وہیں معقولات میں بھی ایک انفرادیت قائم کریں۔ آپ کی خوش نختی سے مجاہد حریت امام المعقولات حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کے فضل و کمال کے امین ان کی علمی جلالت کے شاہکار اعظم خیر آبادی خانوادے کے شمع فروزاں اور معقولات کے امام برحق حضرت مولانا عبدالحق خیر آبادی کی شمع حیات روشن ہے۔ آپ ان سے منطق و فلسفہ کی بلند پایہ کتابیں پڑھ لیں تاکہ دینیات کی طرح معقولات میں بھی آپ کی علمی جلالت کو عظمت و اعتبار کا سند مل جائے۔



ان کی ذات والاصفات سے نسبت تلمذ ہی ایک بڑا اعزاز ہے  
ابھی یہ ذکر جمیل چل ہی رہا تھا کہ حسن اتفاق سے اس مجلس خاص میں  
حضرت مولانا محمد الحق صاحب تشریف لے آئے۔

وہ عجیب پھول سے لفظ تھے ترے ہونٹ جن سے ہنک اٹھے  
میر دشت باغ میں زور تک کوئی باغ جیسے لگا گئے

زبے نصیب! امر جبا اھلاً وسہلاً بڑے موقع سے قدم رنجہ فرمایا اپنے

اے محقق جلیل، علامہ دہر، محقق عصر، امام الحکمتہ، شمس العلماء، تاج الحکماء حضرت مولانا  
عبدالحق خیرآبادی بن مجاہد حیرت امام المعقولات حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی دہلی  
میں ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی دہلی میں  
سررشتہ دار ریڈیو اینٹ عوام رعایا میں ہر دلعزیز حکام و دربار شاہی میں معزز و  
باقدر تھے فرزند ارجمند کی ولادت پر تحائف و ہدایا کے انبار لگ کر لاکھوں روپے  
نذرانے میں پیش ہوا۔

ہوش سنبھالا تو باپ کے علمی مجلسوں کا رنگ دیکھا مفتی صدیق الدین خاں آزرہ  
صدر الصدور دہلی کا دربار علمی کا نظارہ کیا۔ دلی اس وقت بلند پایہ علماء و مشائخ  
شعراء، ادباء کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی ہر چہ چار جانب اصحاب فضل و کمال کے  
سطوت و جبروت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ ہر طرف علم و ادب کے چرچے تھے۔  
والد ماجد نے تربیت کے ساتھ ہی تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی شروع  
کر دیا۔ ہاتھی و پانکی پر آتے جاتے وقت بھی درس دیتے اور پڑھاتے رہتے۔  
سولہ سال کی عمر میں تمام درسیات منقول و معقول سے فارغ التحصیل کر دیا۔ خود مولانا  
(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

یہ مولوی احمد رضا سلمہ ہیں مشہور بزرگ مولانا رضا علی خاں کے پوتے مولانا نقی علی خاں بریلوی کے بلند اقبال صاحبزادے جنہوں نے اس کسبی ہی میں دینیات میں بڑا کمال حاصل کر لیا ہے اپنے وقت کے بزرگ ترین علماء اور یگانہ روزگار شخصیتوں نے ان کی علمی جلال کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور ان کی بلند پایہ تحقیقات کو اعتبار کی سند سے نوازا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ انہیں معقولات کی اہم اور

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) کا آبائی وطن خیر آباد بھی علم و ادب کا گہوارہ تھا شاہی دور میں کشتری رہ چکا ہے۔ ہندوستان کے مردم خیز قصبوں کے صف اول میں شمار رہا ہے۔ خیر آباد دہلی کی علمی صحبتوں کے کم عمری ہی میں مرتبہ کمال کو پہنچا دیا۔ علامہ فضل حق خیر آبادی جب حاشیہ قاضی مبارک لکھ رہے تھے کہ درمیان میں کسی ضرورت سے اٹھ کر چلے گئے۔ اتفاق سے مولانا عبدالحق (جو ابھی زیر تعلیم تھے) کہیں پہنچ گئے۔ علامہ نے جہاں پر قلم روکا تھا وہیں سے آگے اسی بحث کو ایک صفحہ لکھ کر چلے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر صرف چودہ سال تھی حضرت علامہ کے دریافت کرنے پر جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ اور اسے بعینہ باقی رکھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ داروگیر میں دہلی ہی میں تھے باپ کی گرفتاری پر لکھنؤ پہنچ کر پیروی کی۔ جزیرہ انڈمان چلے جانے کے بعد کچھ عرصہ خیر آباد ہی رہے پھر نواب ٹونک کی دعوت پر ٹونک چلے گئے دو سال وہیں قیام فرمایا۔ فضل و کمال اور درس و تدریس کا شہرہ ملک و بیرون ملک تک پھیل چکا تھا طالبان شوق ہر چہار جانب سے کشاں کشاں پہنچ رہے تھے۔ علمی جلال کا غلغلہ سن کر

(باقی اگلے صفحہ پر)

بڑی بڑی کتابیں پڑھا دیں تاکہ منقولات کے ساتھ ہی ساتھ معقولات میں بھی زبردست ملکہ حاصل ہو جائے اور اس میدان میں بھی انکی انفرادیت کا سکہ دلوں پر بٹھ جائے کہ

ع وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے  
 مولانا عبدالحق خیر آبادی جن کی شکوہ علمی اور تبحر کا غلغلہ برصغیر ہند سے نکل کر دور و دراز مالک تک پھیل چکا تھا اور جس کا انھیں احساس بھی تھا۔ اسی احساس برتری کا نتیجہ تھا کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ دنیا میں باکمال حکماء کی تعداد صرف ڈھائی ہے ایک والد مرحوم (یعنی علامہ فضل حق خیر آبادی) دوسرے بحر العلوم فرنگی محلی مولانا عبد العلی لکھنوی۔ اور نصف بندہ عبدالحق جزیرہ اندمان

گورنمنٹ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے لئے خدمات حاصل کر لیں۔ کلکتہ کی ہونا موافق ثابت ہوئی۔ نواب کلب علی کے بے حد اصرار پر رامپور تشریف لائے نواب نے اشاگردی اختیار کی اور تعظیم و تکریم کا حق ادا کر دیا۔ انیس سال تک رامپور میں حاکم مرقعہ اور پرنسپل مدرسہ عالیہ رہے۔ گراں قدر مشاہرت کے علاوہ نواب آٹھ دن بڑی بڑی رقمیں نذرانے میں پیش کرتا رہا۔ مگر مولانا کے شاہانہ داد و بخش کے لیے یہ سب نا کافی ہوتے۔ شہنشاہ امیر تیمور نے جو قدر افزائی علامہ سعد الدین تفتازانی کی کی۔ وہی عزت و توقیر نواب کلب علی نے مولانا کی فرمائی۔ حضرت شاہ بخش اللہ تونسوی سے شرف بیعت حاصل کیا۔ آخر وقت میں والد ماجد کی طرح تصوف کی طرف پوری توجہ مبذول  
 (باقی اگلے صفحہ پر)

(کالاپانی) میں ایام اسیری کے درمیان کسی نے مجاہد حریت علامہ فضل حق خیر آبادی سے پوچھا۔

حضور والا! اپنے پیچھے آپ نے ہندوستان میں عظیم یادگار کے طور پر کیا چھوڑ کے آئے۔ صرف دو چیزیں! حاشیہ قاضی مبارک اور عبدالحق۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا اپنے عظیم باپ کے عظیم بیٹے تھے۔ اور ان کے کمالات علمی کے صحیح جانشین۔ بڑے بڑے رؤسا، امراء، نوابین، راجے، مہاراجے آپ کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے اور انہیں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کبیدہ خاطر نہ ہو جائیں۔

بڑا نازک تعلق ہے دلوں کا  
نہ ہو جائے کوئی خاطر کبیدہ

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) فرمائی۔ خیر آبادی میں ۲۳ شوال المکرم ۱۳۱۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا احاطہ مخدوم شیخ سعدی میں اپنے دادا مولانا فضل امام اور استاذ الاساتذہ ملا علم سندیلوی کے پاس مدفون ہوئے۔ مولانا کی رحلت سے ہر طرف صفا ماتم پچھ گئی ملک و بیرون ملک کے اسلامی مدارس پر سوگوار سناٹا چھا گیا۔ خود خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی نے اپنے مدرسہ اظہر یہ میں ایک ہفتہ تعطیل رکھی اور سوگ منایا ملک و غیر ملکی اخبارات و رسائل و جرائد مقالات، قصیدے اور تعزیت نامے لکھے۔ عالم اسلام نے آپ کی وصال کو پورا طور پر محسوس کیا ہر طبقے میں آپ کی رحلت پر ایک جاں گسل خموشی طاری ہو گئی۔ استاذ وقت امیر مینائی نے تاریخ وفات کہی سے

شمس العلماء ظلمتِ ہر چوں تیرزا بر تیرہ بر حسب  
بر لوح مزار امیر بنویس آرام گاہ امام وقت است (باقی اگلے صفحہ پر)

ایسی صاحبِ کرامت و عظمت ہستی جسے اپنے شخصی عظمتوں، رفعتوں، بلندیوں و علمی و جاہتوں کا نہ صرف احساس بلکہ اس کا پندار بھی ہو۔ بھلا وہ ایک کس و نونیز نوجوان دکھ جس کی مسیں ابھی بھیگ ہی رہی ہوں اور چہرے کا سبزہ شباب کی ابتدائی دہلیز کی طرف اشارہ کر رہا ہو، کو خاطر میں لا سکتا ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) موصوف اکابر و اسلاف کے نادر یادگار تھے ایک ذات واحد میں کمالا غریبہ و اوصاف عجیبہ کا جمع ہونا مولانا کی ذات بابرکات کا خاصہ تھا بقول لسان الملک ریاض خیر آبادی..... زمانہ تو صورت ظاہری کا معاوضہ ہی نہیں ادا کر سکتا۔ وہ نورانی چہرہ وہ خندہ رونی وہ زندہ دلی وہ سراپا علم وہ رعب کمال وہ شان ادب وہ فضل و جلال۔ ع تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

وقار و تمکنت جراتِ اظہار استغناء، نازک مزاجی نوابانہ طمطراق، تفاسط، نزاکتِ دریادلی سیرِ چشمی، حق گوئی، صداقت شکاری یہ سب آپ کی خصوصیات سے ہیں.... دور دراز سے تاجر آپ کی داد و دہنشن قدر دانی، منہ مانگی قیمت کا شہرہ سن کر آپ کے پاس آتے۔ اگر کبھی کسی نے اپنی چیز کی قیمت وہی مانگی جس حساب سے عام لوگوں کو دیتا ہے اور اس کا اظہار بھی کر دیا۔ تو فوراً اسے واپس کر دیتے آپ کی زندگی کے بے شمار واقعات بھرے پڑے ہیں جنہیں دیکھ کر کسی ذریعہ دل باختیار حکمراں کے دربار کا نقشہ سامنے آجاتا تھا خود ہی فرماتے تھے تاجر ہمارا نام سن کر آتے ہیں منہ مانگا دام نہ پائیں تو کاہے کو کوئی آئے لوگوں میں یہ چرچا تو ہے کہ نوابوں کے مانند ایک بورینہ نشین ملائے مکتبی بھی ایسا ہے جو امرا کی طرح دل رکھتا ہے

جن کے دم سے تھی شہر کی رونق : کیا ہوئے وہ کدھر گئے چہرے (انگلے صفحہ پر دیکھئے)

نواب کی دلہہ ہی کے لیے ایک نگہ غلط انداز ڈالتے ہوئے بڑے سرسری طور پر انتہائی خشک لہجے میں دریافت فرمایا۔ میاں صاحبزادے اب تک منطق میں تم نے کون سی کتاب پڑھی ہے

حضور والا ! قاضی مبارک سے

(حیرت و استعجاب کے ساتھ) کیوں صاحبزادے! کیا تم نے تہذیب پڑھی ہے۔

حضور والا! کیا آپ کے یہاں قاضی مبارک کے بعد تہذیب پڑھانی جاتی ہے؟ اس حاضر جوابی نے بلند پیشانی پر سلوٹوں کو نمایاں کر دیا۔

(بقیہ آگے کا) اب ایسے لوگ کہاں جو اپنے علمی و جاہت عالمانہ طمطراق اور اپنی عزت نفس کے تحفظ کے لیے بڑی بڑی شخصیتوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ آج علماء و اہل علم علماء کی اکثریت نے بھی اپنے علمی پندار اور عالمانہ وجاہت و طمطراق کو اہل ثروت و دولت کے سامنے گروہی رکھ دیا ہے اس دور میں اگر کہیں ان کا عکس جمیل کسی حد تک ہی سہی نظر آجائے تو اسے بھی نوادرات ہی میں شمار کرنا چاہئے۔ اس دور میں شیخ الاساتذہ رئیس المحققین حضرت علامہ بدالہ احمد قادری کے برادر خورد مکرم محترم محتشم ذوالجد والفضل والجاہ والکرم شمس الحکماء سند المحققین حضرت علامہ حکیم محمد نعیم الدین صدیقی گورکھپوری میں (ان کی علمی جلالت عالمانہ طمطراق، استغناء، جراتِ اظہار، حق گوئی و صداقت شعاری ان کا علمی فضل و کمال، ان کی نفاست، نزاکت، فطری نازک مزاجی نوابانہ خوب) بہت حد تک حضرت مولانا عبدالحق خیر آبادی کی جھلک ملتی ہے۔

سہ فن منطق کی اعلیٰ ترین کتاب۔ سہ فن منطق کی ابتدائی کتاب۔

صاحبزادے اس وقت آپ کا مشغلہ کیا ہے ؟  
درس دیتا ہوں فتویٰ نویسی اور کتابیں لکھتا ہوں۔  
کس موضوع پر لکھتے ہو ؟

” دینی ضرورت کے پیش نظر جس بھی موضوع پر لکھنا پڑ جائے  
ویسے فقہ میرے قلم کا جولا بنگاہ اسلام کے اندر در آئے ہوئے  
فتنوں کا استیصال میرا مشغلہ۔ فتنہ عظیم و ہابیت کا رد و قلع  
میرا خاص موضوع ہے۔“

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) آپ کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ ایک قتل کے سلسلے میں آپ کے  
ایک شاگرد مولانا ابوالبرکات احمد ٹونکی پر الزام لگا دیا گیا۔ وہ مولانا عبدالحق  
خیر آبادی کے پاس ہی تھے۔ شہر کو تو ال وارنٹ گرفتاری لے کر مولانا کے پاس  
پہنچا۔ جب آپ کو صورت حال معلوم ہوئی۔ تو مولانا نے قہر و جلال کے عالم  
میں کو تو ال کی خوب خبر لی اور ساتھ نواب صاحب کو بھی خوب خوب نوازا  
کہ اکیلا کیوں چلا آیا اس کو بھی ساتھ لاتا تو مزہ آجاتا کہ ایک طالب علم پر  
یہ جرأت کیسے کی۔ کو تو ال طیش میں بھرا ہوا نواب کے پاس پہنچا اور سامنے  
الفاظ دہرا دیا۔ نواب صاحب مولانا کے ناز بردار و قدر داں تھے، لے کو تو ال  
پر برس پڑے کہ مولانا نے میری توہین نہیں کی۔ بلکہ تو نے کی۔ تو ایسے شخص کے  
پاس گیا ہی کیوں۔ جو نواب کو بھی برا بھلا کہہ سکتا ہے۔ اس توہین کا صبر  
تو ذمہ دار ہے۔ سچ ہے کہ۔ ع

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی  
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو یا ہی (بقیہ آگے)

اوه ! تو گویا تم بھی میرے خطی بدایونی کی طرح ہو وہ بھی رات دن ان وہابیوں کے پیچھے ڈنڈے لئے پڑا رہتا ہے۔  
 حضور والا ! رد وہابیت اگر خطبے تو اس کا باقاعدہ آغاز حضور کے والد گرامی قدر حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی ہی نے فرمایا ہے اور اسمعیل دہلوی کے رد میں ایک معرکہ الآرا کتاب تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ تحریر فرمایا ہے جس میں انبیاء و مرسلین و اولیائے کاملین کی بارگاہ کے گستاخ و بے ادب کو بڑی ہی دو ٹوک انداز

(بقیہ پھلے صفحہ کا) شوق و عقیدت کا تقاضہ ہے کہ بس کہتے جائے اور خوف طوالت دامن کھینچتا ہے کہ بس رک جائے ورنہ ان کی زندگی بھر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے  
 ایک کنکر پھینک کر دیکھو ذرات الالباب میں  
 کس قدر موجیں اٹھیں گی سینہ بیتاب میں

مولانا صاحب تصانیف بزرگ تھے آپ کی کتابیں داخل نصاب بھی ہیں۔ حاشیہ

قاضی مبارک، حاشیہ غلام یحییٰ، حاشیہ حمد اللہ، حاشیہ میرزا اہد، امور عامہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ، شرح مسلم التبت، شرح کافیہ، شرح سلاسل الکلام، جو اہر عالیہ، رسالہ تحقیق تلامزم، زبدۃ الحکمۃ وغیرہ وغیرہ مولانا کے تحریر کا یہ حال ہے کہ شرح کو متن سے اس طرح ملاتے ہیں کہ ذرا بھی تسلسل بیان میں فرق نہیں محسوس ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ خود شارح ہی ماتن ہے اور یہ کہ متن و شرح نہیں

۱۰ اشاراتاج النقول محب الرسول حضرت مولانا فضل رسول بدایونی کی طرف ہے یہ آپ کے رفیق درس امام المغفولات مجاہد حیرت حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کے شاگرد تھے۔  
 محمد وارث جمال قادری (بقیہ آگے)



میں کافر و مرتد ہے دین لکھا ہے۔ اور اسمعیل دہلوی کو قال المرید المرتد کے الفاظ سے یاد کیا ہے اور اس پر شرعی حکم نافذ کرتے ہوئے فرمایا۔ قابل این کلام لا طائل از روتے شرع مبین کافر و بے دین است ہرگز مومن و مسلم نیست و حکم او شرعاً قتل و تکفیر است۔ یعنی اس بیہودہ کلام کا قابل (اسماعیل دہلوی) شریعت غزالی کے نزدیک بے شک کافر و مرتد ہے ہرگز مومن و مسلمان نہیں اور اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اس کی گردن مار دی جائے اور اسے کافر قرار دیا جائے اور اس حکم شرعی کی تصدیق و تائید دہلی (جو اس وقت عالم میں انتخاب تھا) کے سترہ جلیل القدر علماء و مشائخ و محدثین زمانہ نے فرمائیں۔

ارے میاں صبا جزا دے! ہمارے مقابلے میں تمہاری حاضر جوابی کا حال یہی رہا تو تم پڑھ چکے اور ہم پڑھا چکے۔

حضور والا! اتنی جسارت بجا بھی اس لئے کر سکا ہوں کہ مجھے شاگردی کا رشتہ ہی نہیں قائم کرنا ہے۔ کہ آپ کی درسگاہ کی حاضر میں بسا اوقات اپنے ان بزرگوں کے حق میں (جن کے لیے دل میں بجد احترام ہے) ایسے جملے بھی سننا پڑے گا جس کو عام حالات میں ہم سن ہی نہیں سکتے۔

تیرا کمال کہ پاؤں میں بیڑیاں ڈالیں  
غزال شوق! کہاں کا اسیر ایسا تھا

(بقیہ آگے کا) نہیں بلکہ مسلسل کتاب ہے۔  
رُج بس گیا ہے ذہن میں ناصر کسی کا روپ  
اب کیا کریں گے پھر کوئی شہکار دیکھ کر

یہ اس شخص کا آغاز شباب تھا جس کا وجود با مسعود اصحاب فضل و کمال  
کی تاریخ میں ایک جہان حیرت ثابت ہوا۔

کائناتِ ارضی کبھی اہل کمال سے خالی نہیں رہی ارسطو، افلاطون  
سقراط، فارابی، البیرونی، ابن سینا، ابن رشد، نیوٹن کپلر،  
گلیلو، غزالی، رومی، رازی، خیام وغیرہ وغیرہ یہ وہ لوگ ہیں،  
جن کے ذکر سے تاریخ کی زلفیں سنواری گئیں اور خود یہ لوگ انسانی  
تاریخ، تہذیب انسانی، انسانی تمدن، انسانی معاشرہ، سیاست میں  
فنون ارتقاء اور تہذیب الاخلاق پر باریں طور پر انداز ہوئے کہ آج  
تک ان کے نقوش سے تاریخ کے صفحات فروزاں ہیں۔  
کچھ نقش تری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک  
دل بے سروساماں سہی ویراں نہیں ہے

مگر چودھویں صدی ہجری کی ابتداء ہی میں برصغیر ہند سے تاریخ کی  
سطح پر ایک ایسا نام مطلع انوار بن کر ابھرا جو علماء، فقہار، عقلاء،  
حکماء، فلاسفہ اور متکلمین کی فہرست میں اپنا بلند نمایاں اور ممتاز  
مقام حاصل کر کے گل سرسبد بنتا ہے۔

اس کی ذات ستودہ صفات سے علوم و حقائق کے اتنے  
سوئے پھوٹے جن سے فکر و آگہی کے ہر شعبے سیراب ہوئے۔ منقولات  
و معقولات میں ایسے حیرتناک کارنامے انجام دیے کہ جن کا صرف تصور  
ہی کیا جاسکتا ہے۔ علماء محققین فقہاء و محدثین کے لئے وہ کعب  
آرزو تو تھے ہی۔ دور جدید کے دانشوروں، فلاسفوں اور سائنس  
دانوں کے لیے ان کے پیکر علمی کا معقولاتی پہلو کم حیرتناک نہیں اپنی

تصنیفات میں نظریہ کشش ثقل، نظریہ اضافیت، نظریہ حرکت زمین  
پر جب فاضلانہ بحث کرتے ہوئے اپنا موقف ثابت کرتے ہیں تو  
وجدان پکاراٹھتا ہے کہ یہ

اک دانش نوری، اک دانش برہانی

ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

اور جب قدیم و جدید فلسفیوں کی طرف رخ کرتے ہوئے فلاسفیوں  
اور سائنسدانوں کی تحقیقات و تخلیقات کا ناقذانہ جائزہ لے کر انکی  
علمی گرفتیں کرتے ہیں۔ مثلاً ابن سینا، شہرستانی، نظام معنولہ  
نجم الدین علی ابن محمد القزوی، شمس الدین محمد بن مبارک، میر  
بخاری، امام غزالی عبدالرحمن بن احمد الایچی، سعد الدین بن مسعود محمد  
تقازانی، نصیر الدین بن جعفر بن محمد طوسی، عبداللہ بن عمر بیضاوی، ملا  
محمد جون پوری، آئینرگ، نیوٹن، البرٹ، آئن اسٹائن وغیرہ  
وغیرہ۔ تو ایک منصف مزاج صاحب بصیرت انسان پکاراٹھتا ہے  
ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ بَعْدَ حِسَابٍ ۝

ع جس سمت آگے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں

ہندوستان کے مشہور شہر بمبئی (روہیل کھنڈ) میں اللہ تعالیٰ نے  
اس رجل عظیم کو پیدا کیا کہ جس کے علمی کارنامے پر ارباب علم و دانش  
کی تاریخ حیران ہے۔ آپ نسباً پٹھان (یوسف زئی)، مذہباً سنی  
سلسلہ حنفی، مشرباً قادری تھے۔ شہر بمبئی کے ایک خوش حال  
متمول اور علمی گھرانے میں ۱۰ شوال المکرم ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۴ جون  
۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔

اے آمدنت باہوش آبادی ما

ذکر بود زمزمہ شادی ما

آپ کا اسم گرامی محمد تاریخی نام المنّت اور جد محترم مولانا رضا  
خان نے احمد رضا لکھا اور اسی نام سے مشہور بھی ہوئے آگے  
چل کر اپنے نام کے ساتھ بالالتزام عبدالمصطفیٰ لکھنا شروع کیا اس  
نسبت غلامی اور ادائے محبت کو تاحیات برقرار رکھا۔ شعر و سخن میں  
اپنا تخلص رضا اختیار کیا۔ ع

احمد ہندی رضا ابن نقی ابن رضا

علوم عقلیہ و نقلیہ کے تحصیل کا یہ عالم کہ چار سال کی عمر میں ناظرہ قرآن  
ختم کیا۔ آٹھ سال کی عمر میں درس نظامی کی مشہور کتاب ہدایۃ النجی  
کی شرح لکھی۔ دس سال کی عمر میں مسلم الثبوت پر حاشیہ لکھا۔ چودہ  
سال کی عمر میں اپنے والد گرامی حضرت مولانا نقی علی خاں صاحب  
قبلہ سے جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کر کے دستارِ فضیلت سے سرفراز  
ہوئے۔ اسی سال دارالافتاء کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ ۲۲ سال  
کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ آفتاب شریعت و طریقت حضرت  
مولانا سید آل رسول مارہروی سے شرف بیعت حاصل کیا۔  
اور اسی وقت مرشدِ کامل نے اجازت و خلافت اور توجہ اتحادی  
سے سرفراز فرمایا۔

۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء والد ماجد کے ہمراہ حج بیت اللہ

وزیارت نبوی کے لیے حاضر ہوئے یہی وہ مبارک سفر تھا جس  
میں آپ کے علم و فضل کا آفتاب پورے طور پر چمکا۔ عرب و عجم

بل و حرم مصر و حجاز بلاد مغرب بالخصوص حرمین طیبین کے بزرگ ترین علماء  
مشائخ نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور احترام و عقیدت سے اپنی اپنی  
گردنیں جھکا کرین پھر اجازت و خلافت اور سندوں کے حصول کا جلد  
نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اسی مبارک سفر میں علماء مکہ معظمہ کی گزارش پر علم غیب رسول محترم  
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تعلق سے ایک عظیم اور تاریخی کتاب بخاری  
عالم میں سائے آٹھ گھنٹوں میں الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیۃ عالم  
وجود میں آئی جس نے علماء حرمین طیبین کو انگشت بندلاں کر دیا۔  
مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علوم پر ایسے  
شہ پارے و گوہر ہائے آبدار سامنے آئے جس نے حرمین طیبین کے جلیل  
القدر علماء و مشائخ کو حیرت زدہ کر دیا۔

علمائے حجاز نے جس قدر و منزلت عقیدت و محبت و عزت و احترام  
کا عظیم الشان مظاہرہ کیا۔ اس کی کوئی دوسری مثال اس عہد  
لے کر آج تک دیکھنے اور سُننے میں نہیں آئی۔ جس کا اندازہ حسام  
الحرمین، اور الدولۃ المکیۃ پر لکھی جانے والی تقریظوں سے ہوتا  
ہے۔ اس سفر میں محافظ کتب خانہ حرم حضرت علامہ سید اسمعیل  
خلیل مکی نے آپ کو چودھویں صدی کے مجدد کا خطاب دیا۔

تفقہ فی الدین کا یہ عالم کہ تقریباً بارہ ہزار صفحات پر مشتمل  
بارہ ضخیم جلدوں میں فتاویٰ رضویہ علمائے حرم کے استفسار پر  
الکفل الفقیہ الفاہم فی احکام قرطاس الدماہم (زبان عربی)  
دو ضخیم جلدوں جہ المتارہ جاشیہ رد المتارہ (زبان عربی) میں سواد اعظم

اہل سنت و جماعت کو عطا فرما کر اپنی فقہی بصیرت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا جس پر فقہیان اسلام کو حیرت و استعجاب بھی ہے اور فرحت مسرت بھی۔ عربی زبان میں آپ کے فناوی کے صرف چند پورا ق دیکھ کر مکہ شریف کے عالم جلیل مولانا سید اسمعیل خلیل بے ساختہ پکار اٹھے۔ وَاللّٰهُ اَقْوَلُ وَالْحَقُّ اَقْوَلُ اِنَّهُ لَوَرَاہَا اَبُو حَنِیْفَةَ النِّعْمَانَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْہُ لَا فَرَّتْ عَيْنُهُ وَ لَجَعَلَ مَوْ لِفَهَا مِنْ جَمَلَةِ الْاَحْبَابِ۔ بخدا میں بالکل سچ کہتا ہوں کہ اگر حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اس فتویٰ کو ملاحظہ فرماتے تو آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور صاحب فتویٰ علیٰ حضرت امام احمد رضا کو اپنے شاگردوں میں شامل کر لیتے۔

یوں تو آپ کی پوری زندگی کارناموں سے عبارت ہے ہر لحظہ ہر آن کارنامے ہی کارنامے !

گویا ع ہر آن نیا طور نئی برق تجلے

ہمدانی ، ہمد جہتی ، مذہبی ، سیاسی ، علمی ، فقہی اور مجددانہ کارنامے جو اپنی وسعت ، تنوع ، مضامین کی بلندی ، جودت فکر اور تعداد کی کثرت کے لحاظ سے ایک پوری اکیڈمی کے صد سالہ خدمات پر بھاری ہیں ایک متحرک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا جو کام تھا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے تنہا انجام دے کر اپنی ہمہ گیر و ہمہ صفت جامع و تابندہ شخصیت کے اتم نقوش پھوڑے وہ کون سا موضوع اور کون سا فن ہے ؟ جو اس عبقری الشرق کے رواں و سیال قلم سے سیراب نہیں ہوا۔

عہ اس طرح کے متعدد تاثرات و واقعات کے لیے میری کتاب الوار کز الایمان کا مطالعہ کریں۔  
محمد وارث جمال قادری

تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، لغت، فرائض، کلام، عقائد، تجوید، تصوف، اذکار، اوقاف اخلاق، تعبیر، تاریخ، سیر، مناقب، فضائل، اسماء الرجال، جرح و تعدیل، نحو، صرف، منطق، ادب، زیجات، جبر و مقابله، جفر و تکسیر، مثلث ارشاد طبعی، لوگاتیم، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، حساب، نجوم، توحید، غرض انسانی فضل و کمال کے پیکر مجسم نے جس سمت رخ کر دیا۔ علوم و آگہی اور معارف و حقائق کے چشمے ابلنے لگے۔ یہ ان کی عظیم تر علمیت کی گہرائی و گہرائی ہی تو ہے کہ آج ایشیا سے لیکر یورپ اور افریقہ سے لے کر براعظم امریکہ تک جدید علمی دانشکدے آپ کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔

برصغیر ہندوپاک میں پٹنہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، جبل یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، افریقہ میں ویل یونیورسٹی، یورپ میں نیوکاسل یونیورسٹی، لندن یونیورسٹی، لیڈن یونیورسٹی۔ امریکا میں برکلی یونیورسٹی، کولمبیا یونیورسٹی۔ یہ وہ جدید علمی دانش گاہیں ہیں۔ جہاں پر امام احمد رضا بریلوی کے منقولاتی و معقولاتی پہلو پر کسی نہ کسی انداز میں کام ہوا اور ہو رہا ہے۔

بے ہودہ گوئی و ہرزہ سرائی و بدنام کرنے کے تمام قبیح ہتھکنڈوں کے باوجود آپ کے علم و فضل کا آفتاب پورے علمی تہذیب کے ساتھ جگمگا رہا ہے اور کائنات بھر کے دانشوروں کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔

جس قدر ہم نے مٹائے تیری یادوں کے نقوش

دل بے تاب نے اتنا ہی تجھے یاد کیا

آپ کے تمام کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ ترجمہ قرآن پاک کنز الایمان ہے جسے ۱۹۱۱ء میں حضرت رسول میں ڈوب کر علم و ادب اور عشق و محبت کا شاہکار بنا دیا۔ جس سے سواد اعظم اہل سنت و جماعت کی آنکھیں ٹھنڈی جگر تازے اور جانیں سیراب ہوئیں ایمان کو تڑپا دیا اور زبان کو ادب کی نئی چاشنی ملی اور سناٹا تھپی بصد نلدا اور دوشے معنی بھی جھوم اٹھی۔

ع خندہ گل جنبش لب بوئے گل تقریر ہے

اس شہید محبت اور کشتہ تیغ نگاہ مصطفیٰ نے جس انداز محبت میں آنکھیں بند کر کے یہ ترجمہ محبت! اہل محبت کو دیا ہے۔ وہ داستان محبت بھی بڑی عجیب ہے۔

اٹی ہی چال چلتے ہیں دیوان گان عشق

آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لئے

تراجم کے ان ہجوم میں جو فضیلت و برتری اور شان امتیاز ترجمہ پاک کنز الایمان کو حاصل ہے وہ اہل علم، اہل ذوق، اہل ادب اہل محبت پر اظہار من الشمس ہے۔

کسی بھی زبان کے لب و لہجہ حسن بیان، اسما لیب بلاغت کو جس حد تک ترجمہ میں سمویا جاسکتا ہے۔ عروج کے اس انتہاء پر

عہ تفصیل کیلئے سوانح اعظم امام احمد رضا از علامہ عبد الدین احمد ضوی۔ یارا قمر الہود کی کتاب انوار کنز الایمان جو ۹ برس پہلے شائع ہو چکی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ محمد وارث چال



کنز الایمان کی انفرادیت اپنی مثال آپ ہے۔

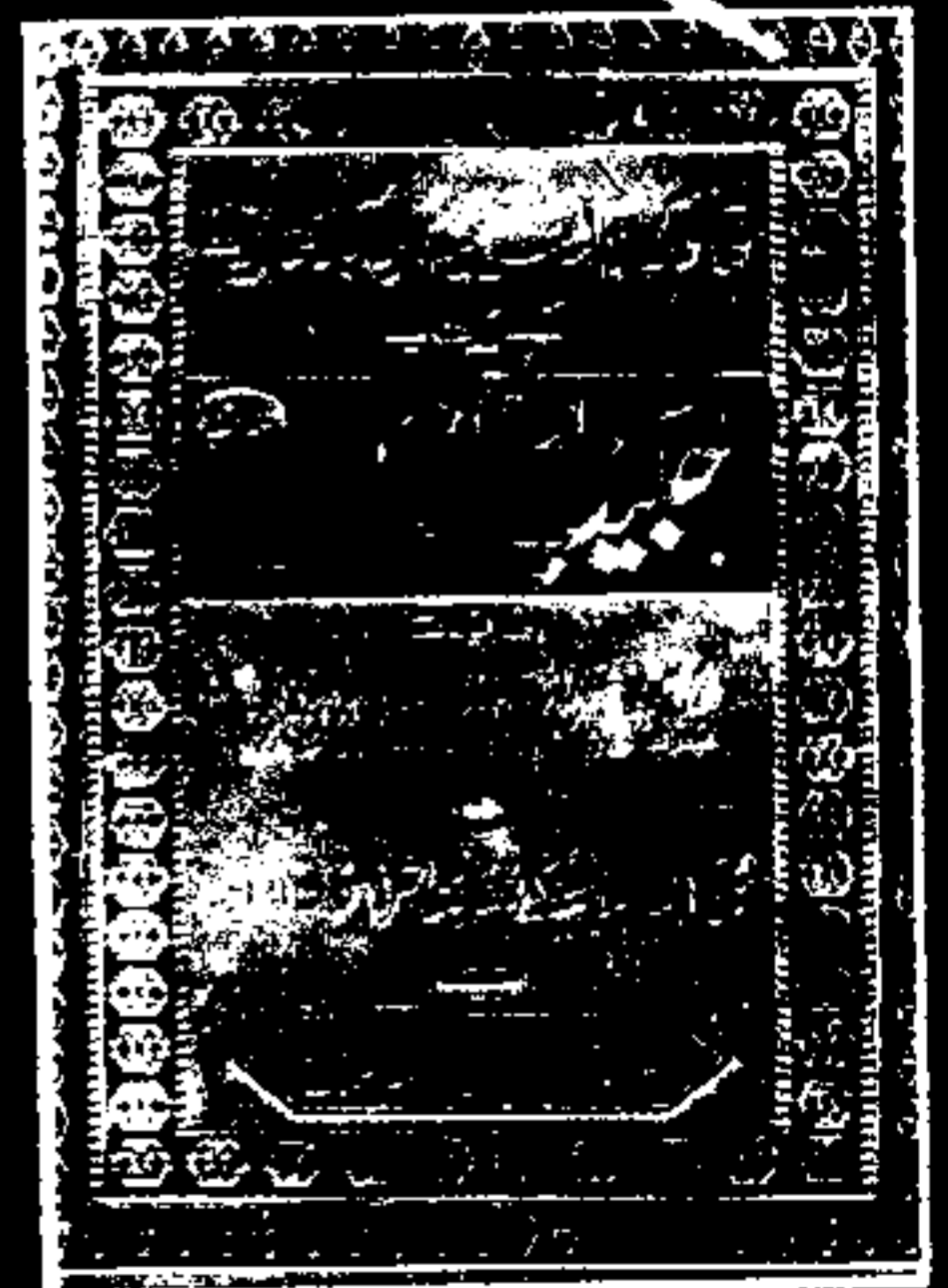
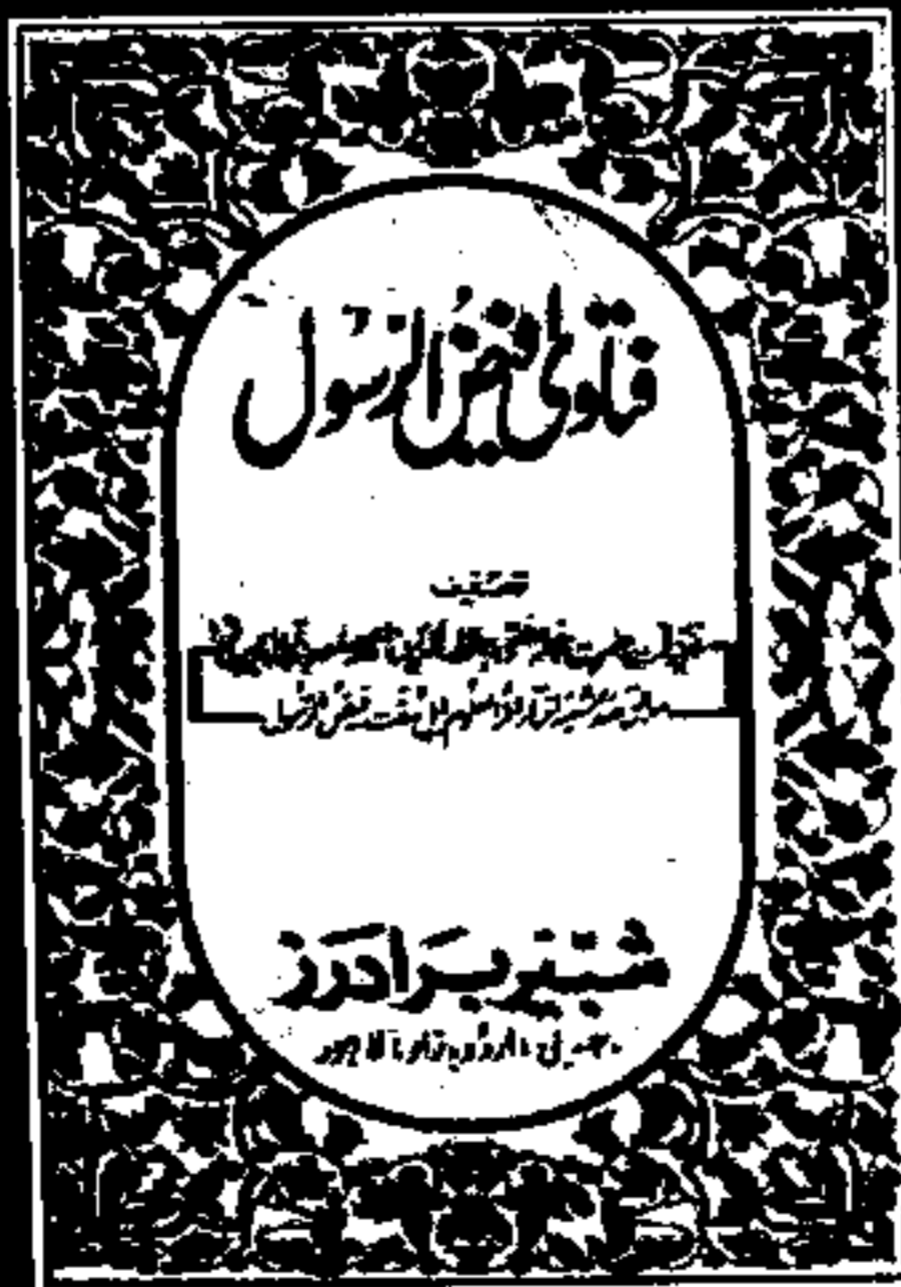
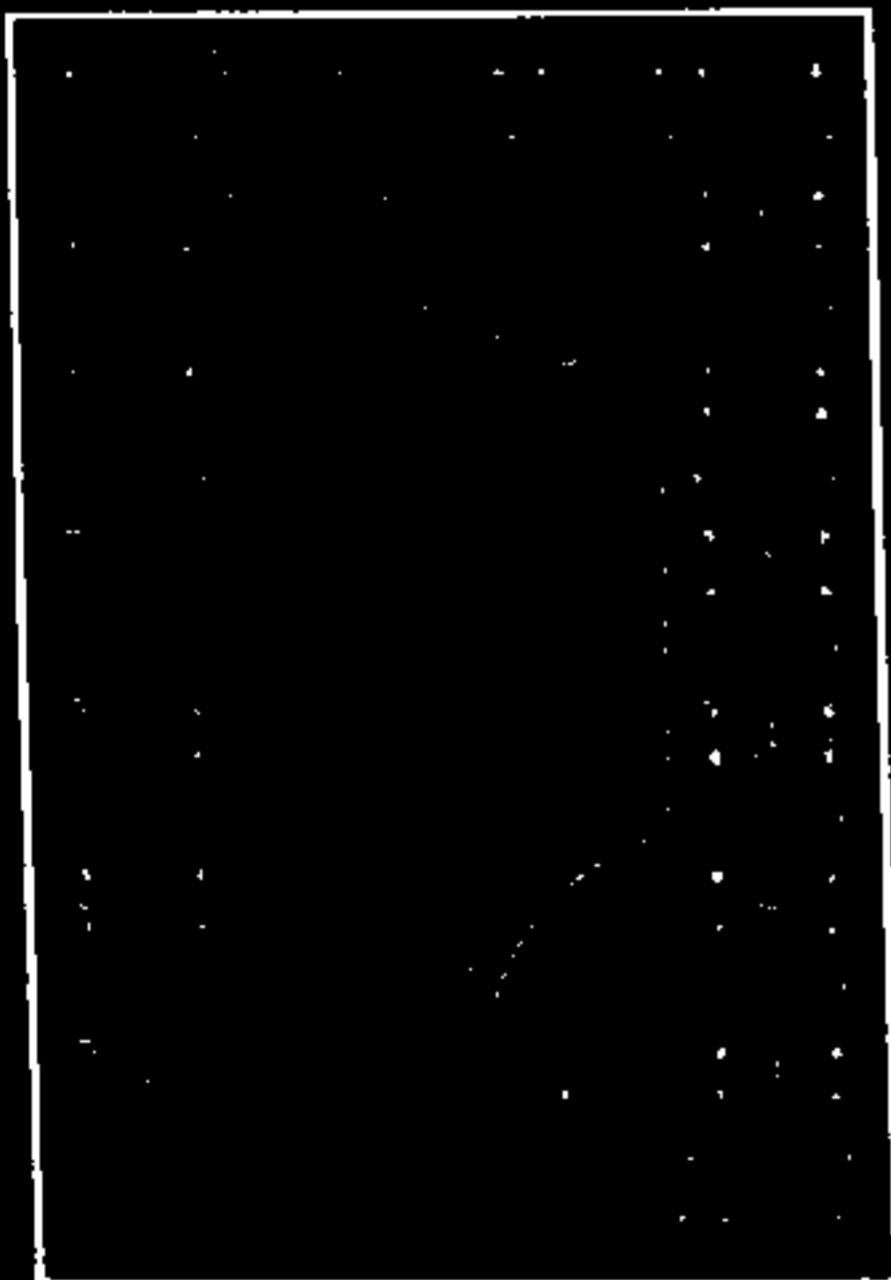
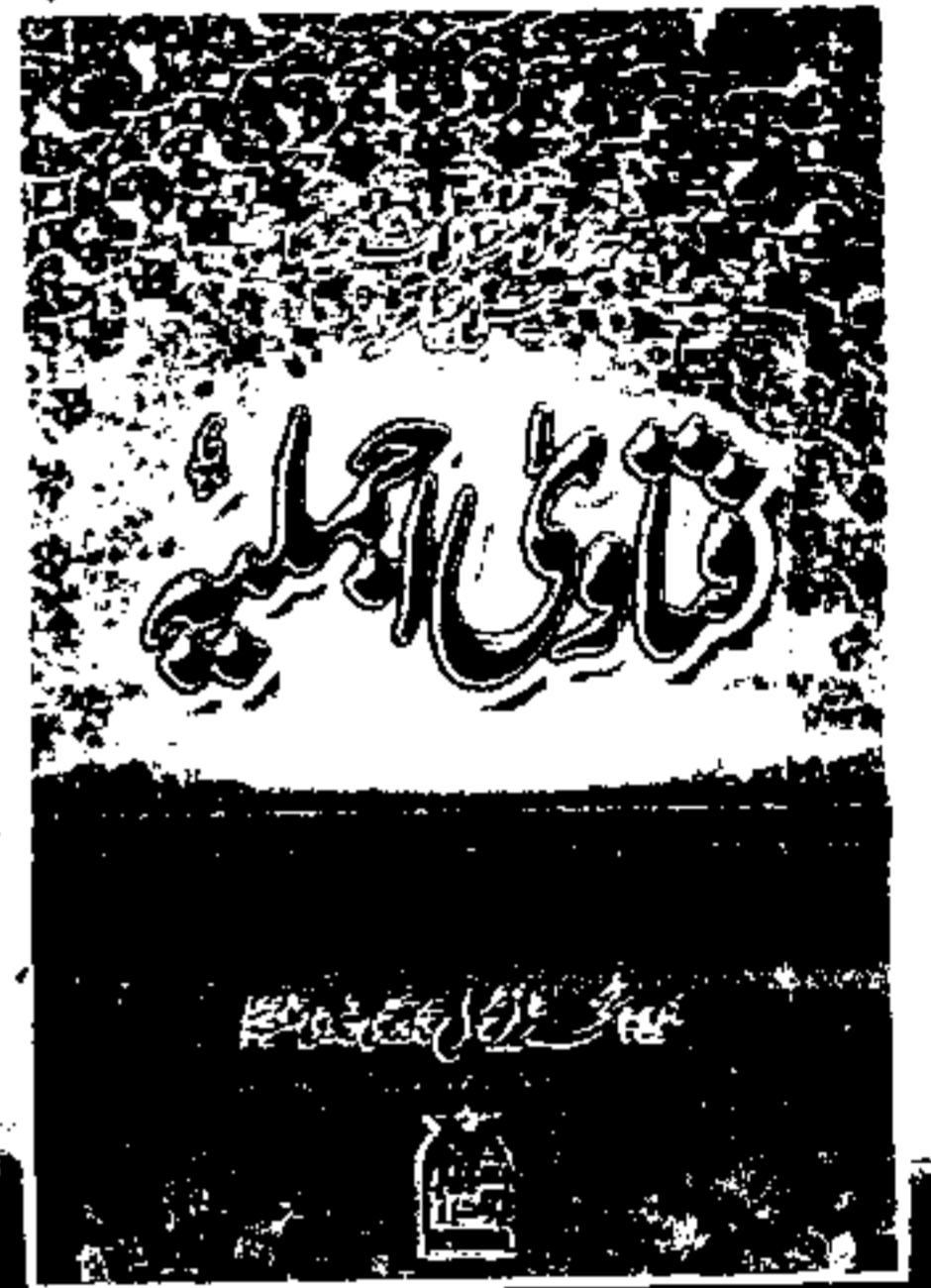
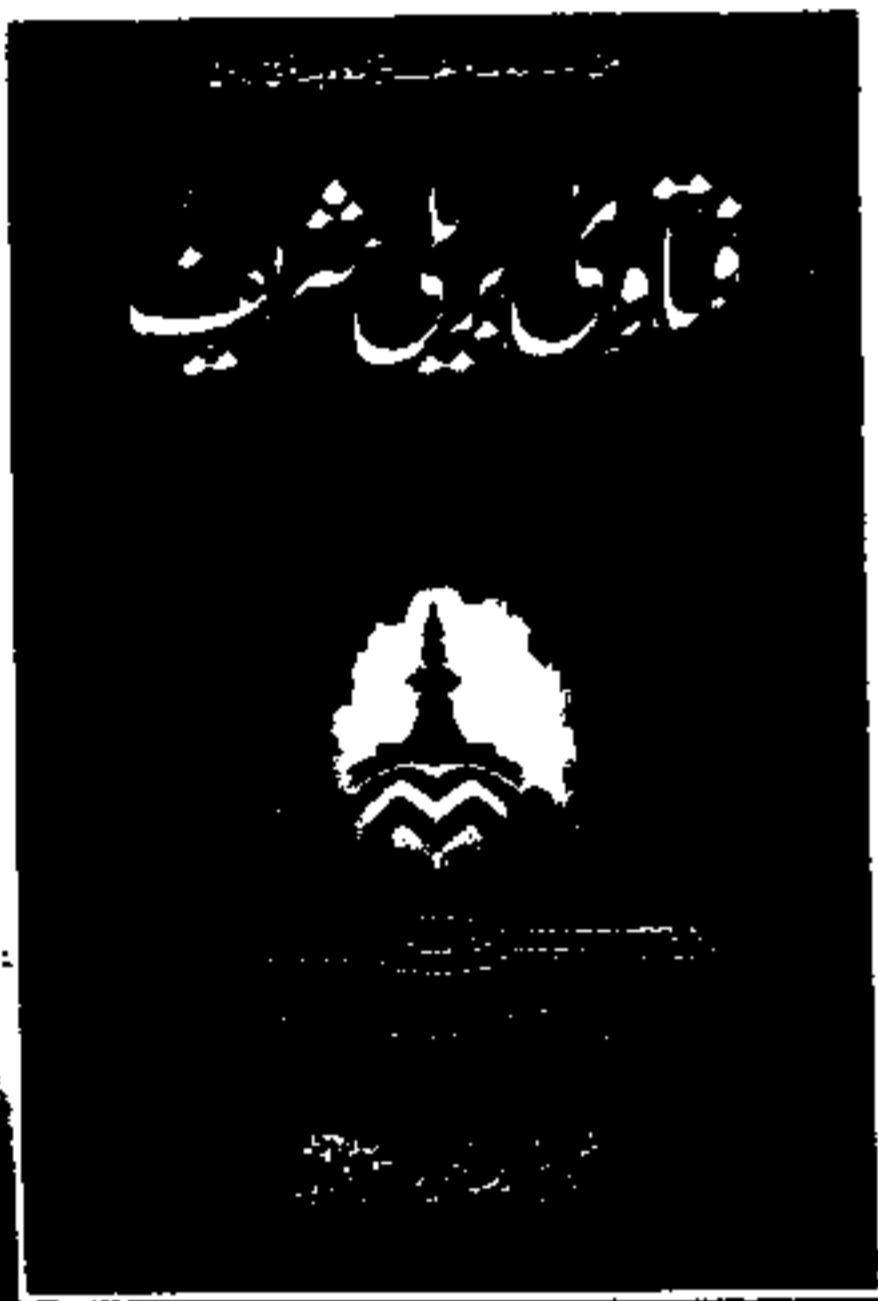
یوں تو کہنے کو اردو زبان میں ترجمے بہت ہیں مگر ایسا ترجمہ قرآن جو صرف قرآن سے کیا گیا ہو۔ جو میزان عشق پر نیا تلا ہو۔ جس کے ہر نازک مقام پر ادب و احتیاط، حزم و اتقائے فکر و دانش، حرمت و تعظیم کے ساتھ ہی سرچشمہ محبت ہی محبت ہو۔ وہ صرف مجدد اعظم سیدنا امام احمد رضا بریلوی کا ترجمہ کہ وہ قرآن مجید (کنز الایمان) ہے۔

جس طرح قرآن کی فصاحت و بلاغت، لسانیات عرب کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ یوں ہی اردو تراجم میں کنز الایمان اردو ادب کا درشاہ ہوا ہے۔ انٹی برس کا طویل عرصہ اردو ادب کو کہاں سے کہاں لے گیا۔ اس عرصے میں نمایاں ترقی کی طرف اردو ادب نے نہ صرف تیزی کا مظاہرہ بلکہ بلندی کی طرف جانے میں جست لگائی ہے بیسویں صدی کے نصف آخر کو اردو ترقی کا دور جدید کہا جاسکتا ہے مگر تقریباً انٹی برس کے بعد آج بھی ترجمہ پاک کنز الایمان اردو زبان و ادب کا نمائندہ و ترجمان بنا ہوا ہے اس ترجمے کی معنوی خوبیاں تو الگ نہیں بلاغت زبان اور حسن ادب کا حال یہ ہے کہ وہ ترجمہ کل بھی اردو ادب کے ذوق نمود کی علامت بنا ہوا تھا اور آج بھی ہندوستانی ادب کدے کا قیمتی سرمایہ !

جسے فاضل بریلوی کی زندہ کرامت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے

بخدمتہ تعالیٰ اعلیٰ حضرت کے خلیفۃ اللہ حضرت محدث اعظم ہند کا ترجمہ پاک معارف القرآن اور حکیم الامت حضرت مفتی احمد یار خان صاحب نعیمی کے تراجم ماضی قرین میں منظر عام پر آچکے ہیں جو کنز الایمان ہی کے عکس جھیل ہیں اور گونا گوں خوبیوں پر مشتمل۔ محمد وارث جمال





www.marfat.com

شعبہ برادری

